اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لہٗ دعوۃ الحق

فون نمبر- دارالعلوم : ۴ — قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار — فون نمبر- رہائش : ۲

ماھنامہ الحق اکوڑہ خٹک

نمبر : ۱۹ — ربیع الاول ۱۴۰۴ھ

شمارہ نمبر : ۳ — دسمبر ۱۹۸۳ء

مدیر : سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ	۳۵/- روپے
〃 〃 فی پرچہ	۳/۵۰ روپے
بیرون ملک سالانہ عام ڈاک	۴ پونڈ
〃 〃 ہوائی ڈاک	۷ پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ آغاز

پچھلے شمارہ میں میرے سفرِ مصر کی اطلاع چھپی تو بجا طور پر قارئین کو رودادِ سفر کا اشتیاق ہوا۔ بہت سے احباب نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ سفرنامہ بھی کہیں "سفرِ چین" کی طرح طاقِ نسیاں کی نذر نہ ہو جائے۔ مگر سفر سے واپس ہوتے ہی وہی ہجومِ اشغال اور متنوع مصروفیات جس میں دلجمعی اور یکسوئی سے کچھ لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے خود خطرہ ہے کہ زیادہ وقت گذرا تو اس سفر کے مشاہدات و تاثرات بھی دھندلے نہ پڑ جائیں۔ لیکن قارئین کی دعا سے اگر خداوند تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اور فضلِ ایزدی نے نوازا تو بہت جلد ان شاء اللہ اس سفر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں گے۔

فی الوقت اس سفر کی اجمالی رپورٹ یہ ہے کہ یہ سفر حکومتِ مصر کی مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کی دعوت پر ہوا۔ پاکستانی مجلسِ شوریٰ کے سات ارکان اور سیکرٹری پر مشتمل یہ وفد چیئرمین مجلسِ شوریٰ جناب خواجہ محمد صفدر صاحب کی قیادت میں ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء صبح دس بجے کراچی سے روانہ ہو کر ظہر کے بعد قاہرہ پہنچا، مصری پارلیمنٹ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر صبحی عبدالحکیم اور دیگر حضرات کی رہنمائی اور انتظام میں پہلے چار دن قاہرہ میں گذرے جو اہم سرکاری استقبالیہ تقریبات میں شمولیت، قاہرہ کے اسلامی آثار و مساجد، عجائب خانوں، جامع ازہر اور آثارِ قدیمہ کی سیر و سیاحت، مجلسِ شوریٰ اور مجلس الشعب (سینٹ) کے سربراہوں، مصری وزیرِ خارجہ، شیخ الازہر اور دیگر اہم شخصیات سے اجتماعی اور انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ صدرِ جمہوریہ مصر سے مذاکرات اور ایسے ہی دیگر بھرپور پروگراموں میں گذرے۔ مقصدِ سفر بھی دونوں برادر اسلامی ملکوں کے باہمی روابط اور تعلقات میں استحکام اور ترقی تھا۔ جس کا داعیہ کچھ عرصہ سے مصر نے بھی بڑے شد و مد سے محسوس کیا ہے۔ الحمدللہ ان ایام میں اسلامی رشتہ پر مبنی اخوۃ و اتحاد کے جذبات کا دونوں طرف سے بھرپور اظہار کیا گیا۔

پانچویں دن یعنی ۲ دسمبر ۱۹۸۳ء صبح نور کے تڑکے ہم لوگ بذریعہ طیارہ قاہرہ سے چار پانچ سو میل دور فراعنہ کے شہر الاقصر (جسے انگریزی میں لکسر لکھتے ہیں) گئے، جہاں کی پہاڑیوں میں چار پانچ ہزار سال قبل فراعنہ کے مقبرے دریافت ہوئے اور کئی فراعنہ کی نعشیں برآمد ہوئیں اور جہاں کے فلک پیما ستونوں پر کھڑے دیوہیکل عبادت خانے اب بھی اپنے بنانے والوں کی عظمتوں کا مذاق اڑاتی اور ان کی عقل و خرد کا ماتم کرتی ہوئی سامانِ عبرت بنی ہوئی ہیں۔ الاقصر میں ایک دن اور ایک رات ٹھہر کر دوسرے دن صبح جہاز سے اسوان شہر جانا

ہُوا جو اپنے اندر قدیم اور جدید تاریخ کے کئی اوراق سمیٹے ہوئے ہے۔ اور جس کا عظیم ڈیم موجودہ مصریوں کی اصطلاح میں اہرامِ جدید ہے۔ یہ تمام دن یہاں گزرا جبکہ عروسِ تاریخ بڑی تیزی سے اپنے چہرے کے حجاب ایک ایک کرکے سرکاتا رہا۔ اور جب اس نے رات کی سیاہی سے اپنا رخِ زیبا ڈھانپ دیا تو ہم سوئے بعد از مغرب دوبارہ قاہرہ کی طرف پرواز کر گئے۔ اب میزبان حکومت نے قاہرہ پہنچتے ہی راتوں رات کاروں کے ذریعہ سکندریہ پہنچانے کا پروگرام بنا رکھا تھا کہ صبح چند گھنٹے سکندریہ کی سیاحت کرکے سیدھا قاہرہ ائیرپورٹ پہنچ کر وفد کی مصر سے مراجعت ہوگی۔ ہمارا ارادہ قاہرہ سے احرام باندھ کر بغرض عمرہ سعودی عرب جانے کا تھا۔ ہفتہ بھر کی شدید تھکاوٹ پھر ایسی رواروی میں یہ اگلا پروگرام ہمارے بس میں نہیں تھا کہ اس کا اثر جدّہ پہنچتے ہی عمرہ کے مناسک اور زیارتِ مدینہ پر پڑ سکتا تھا۔ اس لیے ہماری خواہش پر سکندریہ کا پروگرام ترک کر دیا گیا۔ رات قاہرہ میں رہے اور دوسرے دن یعنی ۲ دسمبر کو پونے چار بجے ہم نے تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے اس شہر کو خیر باد کہا۔ قاہرہ جو اسلامی عظمتوں کا امین، مسجدوں اور اولیاء کا شہر، اہراموں کی بستی اور اب مسلمانوں کے زوال و ادبار کا مرثیہ خواں ہے خیر مقدم کہنے والے اہم شخصیات بشمول صدرِ مجلسِ شوریٰ ڈاکٹر صبحی عبدالحکیم اب الوداع کہنے بھی موجود تھے۔

رات ساڑھے سات بجے ہم ارضِ مقدس کے مطارِ جدہ پر اترے، ہمارا سرکاری دورہ مصر تک محدود تھا اب ہم واپسی میں اپنے طور پر عمرہ و زیارتِ مدینہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے مگر سعودی عرب (جو پاکستان کو ہر لحاظ سے اپنا حقیقی بھائی سمجھتا ہے) نے یہاں از خود ہمیں اپنا مہمان بنا لیا تھا۔ اور قاہرہ چھوڑنے سے قبل پاکستانی سفیر کے توسط سے ہمیں باقاعدہ اسکی دعوت اور اطلاع بھی دیدی گئی تھی۔ جدّہ ائیرپورٹ پر پاکستانی سفارت کاروں کے علاوہ سعودی شاہی پروٹوکول کے حضرات بھی موجود تھے جو پہلے ہمیں سیدھے جدّہ کے شاہی مہمان خانہ قصر المؤتمرات والضیافۃ لے گئے جہاں وفد کو ٹھہرایا گیا میں نے قاہرہ سے احرام باندھ لیا تھا جبکہ باقی ساتھیوں کی رائے جدّہ سے احرام باندھنے کی ہوئی۔ جب سب ساتھی احرام باندھ چکے تو ہمیں جدّہ سے مسجد حرام لے جایا گیا۔ دس ساڑھے دس بجے رات ہم حرم شریف پہنچے، ہجوم نہیں تھا، بڑے اطمینان سے دو ڈھائی گھنٹہ میں طواف، اور سعی سے فارغ ہوئے۔ احرام کھولا، کچھ دیر مزید حرم میں رہے۔ تین بجے شب جدّہ اپنے قیام گاہ واپس پہنچا دیئے گئے۔

اللہ کے نیک بندوں کو کبھی خواب میں حرمین کی زیارت ہو جاتی ہے۔ مگر ہم گنہگاروں نے تو گویا جاگتے میں ایک حسین اور مبارک خواب دیکھا کہ رات کے چند گھنٹے کعبۃ اللہ کے سایوں میں گذرے اور جب صبح آنکھ کھلی تو اپنے بستر پر تھے۔ دن کو ساڑھے بارہ بجے کے جہاز سے جدّہ سے مدینۃ النبی الکریم روانگی ہوئی۔ کوئی گھنٹہ بھر

میں مدینہ طیبہ پہنچے، خیال تھا کہ ظہر کی نماز مسجد نبوی میں پڑھیں گے، مگر یہاں بھی سعودی میزبان موجود تھے جو اوّلاً ہمیں قصر الضیافہ لے گئے، سامان اپنے اپنے کمرہ میں رکھوایا، وضو کیا اور اب ظہر کی بجائے عصر کی نماز مسجد الرسول میں نصیب ہوئی کہ وہاں ظہر زوال ہوتے ہی پڑھ لی جاتی ہے۔ باقی سارا دن اور رات کا کچھ حصہ جوار رسول کریمؐ ہی میں رہے۔

دوسرا دن یعنی ۶ر دسمبر کا سارا دن بھی مدینہ طیبہ میں نصیب ہوا، ظہر تک مشاہد و زیارات پر حاضری ہوئی ظہر سے مغرب تک مسجد نبوی میں قیام رہا۔ مغرب کی نماز پڑھتے ہی باب السلام سے (جہاں پہ دوستوں کی گاڑیاں منتظر تھیں۔) مطار مدینہ طیبہ پہنچے مدینہ طیبہ کے ابن العام جو امیر مدینہ کے بعد دوسرے اہم شخص اور مدینہ طیبہ کے میئر ہوتے ہیں الوداع کے لئے موجود تھے۔

رات جدہ ٹھہرے اور سات دسمبر کو دو ڈھائی بجے دبئی روانگی ہوئی، جہاز ظہران ٹھہر کر دبئی پہنچا۔ تو عرب امارات میں موجود کئی فضلاء، علماء، احباب اور پاکستانی دوستوں کو ائیرپورٹ پر چشم براہ پایا۔ ان کی محبت وخلوص کے سایوں میں دو دن دبئی میں اور دو دن ابوظہبی، العین، شارجہ میں قیام رہا یہ قیام جو اولاً دو دن کا میں نے بنایا تھا احباب کی بے پناہ محبت اور اصرار پر دو دن مزید بڑھ گیا جو پھر بھی نہایت مختصر تھا مگر کرم فرماؤں نے از راہ محبت ان ایام کا ہر ہر لمحہ ایسا مصروف رکھا کہ مختصر وقت میں علماء وفضلاء اور پاکستانی احباب کی ایک بہت بڑی تعداد سے ملاقات ہو گئی گو وہ صرف اجتماعات میں خطاب کی حد تک رہی اور بسا اوقات تنگئ وقت کی وجہ سے مصافحہ کا موقع بھی نہ مل سکا۔

ان تین چار ایام میں آٹھ دس تقریبات میں شرکت ہوئی اور تقریباً اتنی دفعہ خطاب بھی ہوا عرب امارات کا یہ پروگرام جو انہوں نے اپنے طور پر رکھا تھا اور وفد کے باقی ارکان جدہ ہی سے واپس ہوئے۔ دو چار دن کے باوجود وہاں کے علمی ودینی سرگرمیوں اور ہمارے علماء کرام کی جماعتی تگ ودو سے کافی حد تک تعارف کا موجب بنا فضلاء حقانیہ، احباب اور علماء کرام نے جس گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اس کا میں ہرگز اہل نہ تھا۔ مگر علم اور دین سے جو برائے نام نسبتیں تھیں ان لوگوں نے دراصل اسکی قدر افزائی کی جس کا اجر اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرمادے۔ ۱۲ اور ۱۳ر دسمبر کی درمیانی شب وطن واپسی ہوئی اور یوں دو ہفتے کا یہ سفر بخیر وعافیت ختم ہوا۔

بہرحال یہ مختصراً اس سفر کا اجمالی بیان تھا۔ اگر قدرت نے توفیق دی تو انشاء اللہ اپنے احساسات اور مشاہدات پر آئندہ فرصتوں میں روشنی ڈالنے کی سعی کروں گا۔

نئے سال ۱۹۸۴ء کا پہلا ہفتہ اپنے ساتھ دو جیّد اور بزرگ علماء کی جدائی کا صدمہ لیکر آیا ـــــ اولاً

حضرت مولانا قاضی عبد السلام صاحب مرحوم جو دیوبند کے جید فضلاء اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے مرحوم کا تعلق علم و عرفان کی بستی زیارت کا کا صاحب سے تھا۔ عمر بھر دین کی خدمت و اشاعت ان کا شیوہ رہا جس بات کو حق سمجھتے ڈنکے کی چوٹ اس کا اظہار کرتے گو اس کی زد اپنوں پر کیوں نہ پڑتی۔ نوشہرہ صدر کی جامع مسجد ان کی دعوتی جولانیوں کا میدان اور خطابت کی رزم گاہ بنی رہی۔ اب عرصہ سے صاحب فراش تھے یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو آبائی گاؤں زیارت کا کا صاحب سپرد خاک ہوئے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے ضعف و علالت کے باوجود جنازہ میں شرکت کی اور نماز جنازہ پڑھائی ـــــ مولانا مرحوم اپنی سادگی، وارفتگی اور بزرگانہ اداؤں میں اسلاف کا نمونہ تھے، حق تعالیٰ مقامات قرب و رضا سے نوازے۔

دوسرے بزرگ ناموس صحابہؓ کے منادا اور مسلک اہل سنت والجماعت کے ترجمان مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری تھے جن کا ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو ملتان میں انتقال ہوا۔ عمر بھر کا مشغلہ شان صحابہؓ کا دفاع اور شاتمین صحابہؓ کا تعاقب رہا وہ تنظیم اہل سنت والجماعۃ کے بانی حضرات میں سے تھے ایک عرصہ تک تنظیم کے جریدہ ـــ دعوت ـــ کے ذریعہ اور عمر بھر منبر و محراب سے اہل رفض کے جواب میں صحابہ کرامؓ اور اہل سنت کی ترجمانی کرتے رہے۔ تقریر و خطابت کا خاص انداز تھا دار العلوم حقانیہ کے ابتدائی دور کے سالانہ جلسوں میں شرکت فرماتے۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی مگر ان کی خطابت کا انفرادی انداز پھر خاص سٹائل کا طرح دار عمامہ اور مجاہدانہ شان، دل پر کچھ عجیب سا نقش ثبت کر گئی تھی۔ حق تعالیٰ اس مرد حق کو حمیت حق کے بدلے عظیم درجات سے نوازے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

خط و کتابت و ترسیل زر کے لئے
خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

ادارۂ الحق

جہادِ افغانستان

—————— جذبۂ شہادت اور جان سپاری کے بے مثال واقعات

دارالعلوم حقانیہ میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے ملنے اکثر مجاہدین افغانستان تشریف لاتے رہتے ہیں اور مجاہدین کے جذبۂ جہاد، نصرت خداوندی اور شہداء کے روحانی مقامات اور بارگاہِ خداوندی میں ان کے تقرب اور کرامۃ کے ایسے واقعات سننے میں آجاتے ہیں جن سے ایمان کو جلاء اور یقین کو پختگی حاصل ہوجاتی ہے ۔ ایسے بعض واقعات الحق کے وقائع نگار ابوالقاسم کے قلم سے ۔ (سمیع الحق)

عیدالاضحیٰ (۱۴۰۳ھ) کا بارہواں روز تھا جب مجاہد حبیب نور کا جنازہ ان کے گھر پہنچایا گیا۔ ان کی شہادت کا آج تیسرا روز تھا۔ لواحقین و رشتہ داروں کے علاوہ سینکڑوں مسلمان تھے جو شہید حبیب نور کا آخری دیدار کر رہے تھے کہ اچانک، مرحوم کے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی، دیکھا جا رہا تھا اور دیکھنے والے ایک نہیں سینکڑوں تھے۔ کہ مرحوم کی آنکھیں بند ہیں وجود بے حس ہے۔ اور جسم سارا لہولہان۔ مگر ہونٹ ہیں کہ تیزی سے حرکت کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ پڑھ رہے ہیں۔ امیر صاحب نے کان قریب کئے تو معلوم ہوا کہ مرحوم ذکر کر رہے جسے کان لگا کر آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر ایک نہیں سب نے دیکھا، اور سب نے سنا کہ اللہ کے راستے میں جان کی بازی لگا دینے والا، اب بھی زبان سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ اللہ والے "یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم ۔" کا عملی پیکر تو ہوتے ہیں ہی، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ رب عزیز کے فضل وکرم سے مرنے کے بعد بھی ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے ہیں، دنیائے عالم کیلئے موجب حیرت و درس عبرت بن جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ شہداء ہی بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون کے مصداق ہیں۔

مجاہد حبیب اللہ شہید جنہیں ابھی چند روز قبل روسی دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے بارگاہِ الوہیت

سے خلعت شہادت نصیب ہوئی کے بیسیوں رفقاء کا بیان ہے کہ شہادت سے قبل مجاہد حبیب اللہ نے بارہا کہا، صرف کہا نہیں بلکہ قسم کھا کھا کر یقین دلایا۔
دوستو! "وہ دیکھو سامنے جنت ہے" تمام رفقاء حیرت میں تھے۔ مجاہد حبیب اللہ نے فرمایا۔ حیران کیوں ہوتے ہو، جنت تو میرا مشاہدہ ہے۔ اللہ کی قسم جنت مجھے دنیا میں دنیا کی آنکھوں سے نظر آرہی ہے — نگاہیں جنت پر تھیں، منزل مقصود کو روانہ ہوئے۔ روسی دشمن سے مقابلہ ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر نہیں گزرنے پائی تھی کہ مرحوم جس مقام کو دیکھ رہے تھے وہیں پہنچ گئے۔

مجاہدین کی ایک جماعت نہتے ہاتھوں، روسی دشمن کے مسلح فوجیوں کا مقابلہ کرتی رہی، یہ مقابلہ بہت سخت تھا اور پہلے کی نسبت زیادہ صبر آزما۔ جب لڑائی بند ہوئی اور مجاہدین اپنے ٹھکانوں پر واپس لوٹے اور ایک دوسرے کا حال معلوم کیا۔ مگر مجاہد بسم اللہ شہید کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ خیال تھا کہ روسی دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے ہیں یا جام شہادت نوش کر کے ابدی نیند سو گئے ہیں۔ تلاش جاری ہوئی، رفقاء نے لڑائی کے تمام محاذوں کو چھان مارا، مگر کہیں بھی نشان نہ مل سکا۔ رفقاء مایوس ہو گئے اور یہی سمجھنے لگے کہ دشمن نے انہیں گرفتار کر لیا ہوگا، یا ان کی نعش تک کو غائب کیا ہوگا۔ مگر رب العالمین کی قدرت کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ تیسری شب مجاہد بسم اللہ جان کی والدہ کو اپنے لخت جگر کی خواب میں زیارت ہوتی ہے۔ عرض کرتا ہے امی جان! تمہیں اپنے لخت جگر کے دفنانے کا غم کیوں نہیں۔ والدہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے عرض کیا عزیز بیٹے! ہم نے تو اپنی حد تک تلاش بسیار کی ہے۔ مگر تمہارا کوئی پتہ نہیں چل سکا، آخر ہمیں اتنا تو بتا دو کہ تم ہو کہاں؟ خواب میں بسم اللہ جان شہید نے وہ مقام بتایا جہاں ان کی لاش پڑی تھی، صبح ان کی والدہ نے مجاہدین کے امیر سے بات کی، اسلامی فوج کے سپاہی اشارہ پاتے ہی اس مقام پر پہنچ گئے۔ جسطرح اور جن آثار کے ساتھ والدہ نے مقام کی نشاندہی کی تھی اسی طرح انہی آثار کے ساتھ شہید بسم اللہ جان کو وہیں پایا گیا۔

تیسرے روز مل جانے والے شہید کا جسد اطہر اتنا نرم، ملائم اور تر و تازہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسا خدا کی رحمت نے اسے ابھی ابھی اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ اور ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا ہو۔

ولایت غزنی سے تعلق رکھنے والا نوجوان مجاہد محمد ظاہر خان شہید اپنے مجاہدانہ کارناموں اور زبردست ایثار و قربانی اور بے مثال جان فروشی کے باعث معروف اور تمام مجاہدین کے محبوب تھے اور کافی عرصہ سے اشتراکیت اور کمیونزم اور روسی سامراج سے برسرپیکار تھے۔ موصوف کی شادی کی تقریب تھی، مجاہدین بڑی تعداد میں شریک تقریب تھے۔ عصر کا وقت تھا اپنے محبوب قائد کی برات کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ مخبروں نے روسی دشمن کو اطلاع کر دی، دشمن نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر بڑے زور کا حملہ کیا۔ مجاہدین مدافعت کیلئے

آگے بڑھے، مجاہد محمد ظاہر خان بھی اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ بڑی بے جگری اور دلیری کے ساتھ میدانِ کارزار میں مردانہ وار کود پڑے۔ دوستوں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے یہی بہتر ہے کہ تم اس معرکہ سے اپنے کو الگ رکھو۔ مگر محمد ظاہر خان کی رگوں میں اسلامی حمیت، جاں نثاری و سرشاری کا خون متلاطم تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی بقاء کی خاطر اسکی دل کی دھڑکنیں بے قرار تھیں اور اپنی بڑی سے بڑی خوشی وحدت پر جاں سپاری میں قرار سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ دوسرے مجاہدین کے شانہ بشانہ دشمن سے مردانہ وار لڑتے خدا جانے کتنے دہریئے اور روسی دشمنوں کو جہنم رسید کرتے ہوئے خود خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے جب مجاہد محمد ظاہر خان کی خونِ شہادت میں وصلی ہوئی نعش گھر لائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دولہا نے خونِ شہادت کو شبِ عروسی کیلئے لباس کے طور پر زیب تن کر لیا ہے۔ قدرت کی نیرنگی اور ربّ کائنات کی بے نیازی دیکھئے کہ عین اس وقت (جب شہید محمد ظاہر خان گھر لائے گئے) ان کی دلہن بھی گھر لائی گئی اور اتفاق سے اسکی عروسی بھی سرخ تھی، ادھر شہید محمد ظاہر خان کی نگاہِ انتخاب بھی خوب کو چھوڑ خوب تر پر جم گئی۔ اور آج شہید موصوف کی نگاہیں زوجہ فی الدنیا کی بجائے جنت کی حوروں پر کھل رہی تھیں۔

ایک مسلمان خاتون کی جرأتِ ایمانی اور غیرتِ اسلامی کا یہ واقعہ بھی اس قدر حیرت انگیز ہے۔ کہ قرنِ اوّل کی مسلمان خواتین اور صحابیات کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ اس خاتون کا شوہر کمیونسٹ ہو گیا اور مسلمان مجاہدین سے مقابلہ کی غرض سے کارمل فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے گاؤں پر مجاہدین کا قبضہ تھا۔ اس وجہ سے وہ اپنے گھر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ بیوی کو خفیہ پیغام بھیجا کہ میرے پاس فلاں مقام پر پہنچ جاؤ۔ بیوی نے تحریری جواب بھیجا کہ میں مسلمان ہوں اور میرے والدین بھی مسلمان ہیں، مجھے غیرتِ ایمانی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ جیسے بے دین، دہریئے اور بد مذہب کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ تم مرتد ہو چکے ہو اور میں بحمد اللہ اسلام پر قائم ہوں۔ چونکہ تمہارے ارتداد کے بعد ہمارے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے آئندہ میرا تصوّر بھی نہ کرنا، میرا آنا تو ہے ہی ناممکن، اگر تم بھی گھر آئے تو یاد رکھنا میں نے اپنے بچوں کو بندوق چلانا سکھلا دیا ہے۔ تمہاری ضیافت تمہارے بچے بندوق کی گولیوں سے کریں گے۔

جب اس مجاہدہ مسلمان خاتون کا یہ خط اس نے دیکھا تو غصہ ہوا اور ساتھیوں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اب میں اپنی بیوی کو زبردستی لاؤں گا۔ چنانچہ اس غرض سے کسی حیلے بہانے ایک رات گاؤں آکر اپنے گھر داخل ہوا۔ مسلمان خاتون نے ناگہاں ایک مرد کی آہٹ سن کر آواز دی، کون ہو؟ اس نے جواب دیا تمہارا شوہر۔ خاتون نے اسے نکل جانے اور قریب نہ آنے کیلئے کہا، مگر وہ باز نہ آیا اور آگے بڑھنے لگا تو خاتون نے بچوں کو آواز دی جنہوں نے فوراً بندوق کی گولی داغ کر اپنے والد کو جہنم رسید کر دیا۔ اور والدہ کی عزت کو

محفوظ رکھا۔

عید الاضحیٰ کی مبارک رات تھی اکثر مجاہدین حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ حسنہ کو زندہ کرنے اور ان کی یاد منانے گھروں کو جا چکے تھے اور چھاؤنی (جس پر مجاہدین کا قبضہ تھا) میں مجاہدین کی قلیل تعداد تھی جو باقی رہ گئی تھی۔ روسی دشمن نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور بڑی تیاری اور بہت بڑی بھاری تعداد فوج کے ساتھ چھاؤنی پر حملہ آور ہوا اور اسّی ٹینکوں، دسیوں بکتر بند گاڑیوں اور ہوائی جہازوں سے مجاہدین کی چھاؤنی زبردست بمباری کی مجاہدین کو ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ مجاہدین نے بھی استقامت اور پامردی سے دشمن کا مقابلہ کیا صبح تک جنگ جاری رہی، آخر دشمن کو جو ہر طرح کے سامان جنگ سے مسلح تھا، اپنی بھاری اکثریت کے باوجود بہت کم اور قلیل مجاہدین کے مقابلہ میں بری طرح ناکامی و نامرادی اور عبرتناک شکست کے ساتھ واپس ہوا۔ مجاہدین کو بڑی مقدار میں اسلحہ توپیں مشین گنیں اور پچاس مختلف قسم کی گاڑیاں مال غنیمت کے طور پر حاصل ہوئیں اور روسی کارمل فوجیوں سے دو سو چالیس سے زائد افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

وضو قائم رکھنے کے لئے جوتے پہننا بہت
ضروری ہے ہر مسلمان کی کوشش
ہونی چاہیئے کہ اس کا وضو قائم رہے۔

سروس انڈسٹریز
پائیدار۔ دلکش۔ موزوں اور
واجبی نرخ پر جوتے بناتی
ہے

Servis
سروس شوز
قدم قدم حسین قدم قدم آرام

ٹینڈر نوٹس

سرکاری شعبہ سے متعلق ایک ادارے کو مندرجہ ذیل آئٹمز کے لئے ممتاز ڈیلر/اسٹاکسٹس سے ایف او آر راولپنڈی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو زیر دستخطی کو ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو ۲ بجے تک موصول ہو جائیں ان ٹینڈرز کو اسی دن اس وقت حاضر ٹینڈر دہندگان کے سامنے کھولا جائے گا۔

۱۔ ایگزاسٹ فینس ۱۲" قطر — ۲ عدد

۲۔ " ۱۶" قطر — ایک عدد

۳۔ ایئر کنڈیشننگ فلٹر سائز ۱" × ۲۵" × ۲۰" ، ۲" × ۲۵" × ۲۰" ، ۲" × ۲۰" × ۱۶" ، ۲" × ۲۰" × ۳۰" ، ۲" × ۱۶" × ۱۶"۔ — ۲۴-۲۴ عدد

۴۔ ورنیئر کیلیپر ۱۲" — ۲ عدد

۵۔ جی آئی شیٹ ۲۴ ایس ڈبلیو جی ۴' × ۶' — ۱۸ عدد

۶۔ روم ایئر کنڈیشنرز ۱½ ٹن ۱۸۰۰۰ بی ٹی یو/ایچ آر، ۵۰ سی/ایس ۲۲۰ وولٹس، اے ٹی سی، نیشنل کلائمیکس ڈیلکسے۔ — ۷ عدد

۷۔ رال بولٹس — ۳۶ عدد

۸۔ ٹیوب راڈ ہولڈر ۲۵۰ وولٹس ۱۲۰ ایمپس نمبر ۶۱۴۲۷ برائے ۴۰ واٹس ٹیوب راڈز فلپس یا اسکے مساوی — تعداد ۳۰۰

۹۔ اندراج بالا کے مطابق لیکن نمبر ۱۱۴۲۶۹ ۔ ایضاً۔ — تعداد ۱۵۰

۱۰۔ ٹیوب راڈ ہولڈرز برائے فلپس ٹائپ فٹنگ ٹی کے ۱۲، فلپس یا جاپانی۔ — ۱۰۰ جوڑے

۱۱۔ پلاسٹک کور برائے فلپس لائٹ فٹنگ ایچ پی کیو ۱۲۷ (ڈرائنگ اے ۷۰ میں دیکھی جاسکتی ہے) — ۱۲ عدد

۱۲۔ پلاسٹک کورز برائے فلپس ٹائپ ۲۴۰ جی سی ڈی لائیٹس — ۱۵۰ عدد

۱۳۔ سن ڈیک لائٹ (ڈرائنگ اے ۷۰۰ میں دیکھی جاسکتی ہے) — ۱۲ عدد

درج کردہ مالیت کے ۲٪ مساوی زر ضمانت بینک ڈرافٹ، ڈپازٹ ایٹ کال کی شکل میں لازماً ٹینڈر کے ساتھ جمع کرانا ہوگا ورنہ ٹینڈر مسترد ہو جائیگا۔ ریٹس کارآمد و برقرار رہنے کی مدت ٹینڈر کھلنے کی تاریخ سے ۹۰ یوم سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ حکام مجاز کو اختیار ہے کہ وہ کوئی سبب بتائے بغیر کسی بھی یا تمام ٹینڈرز کو مسترد کردیں یا کسی بھی ٹینڈر کو منظور کرلیں۔

سینئر پروکیورمنٹ آفیسر

فون نمبر ۴۳۳۰۳

۷۰۔اے سٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی

PID (Islamabad) 2769/47

رسول اکرم کا سب سے بڑا معجزہ
قرآن

جناب وحید الدین خان

ہر پیغمبر کا ایک معجزہ ہوتا ہے اور پیغمبر آخر الزماں کا معجزہ قرآن ہے۔ جو پیغمبر قیامت تک کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، اس کا معجزہ کوئی ابدی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ خدا نے قرآن کو پیغمبر آخر الزماں کا ابدی معجزہ بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے مسلسل مطالبہ کیا کہ پچھلے نبیوں کی طرح تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ۔ قرآن میں صاف اعلان کر دیا گیا کہ اس نبی کے لئے پچھلے نبیوں جیسا کوئی معجزہ نہیں بھیجا جائے گا (بنی اسرائیل ۵۹) حتیٰ کہ قرآن میں کہا گیا کہ اے رسول اگر تجھ پر ان کا اعراض گراں گزرتا ہے (اور تم ان کے لئے کوئی معجزہ چاہتے ہو) تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا کوئی سیڑھی آسمان میں لگاؤ اور پھر ایک معجزہ لا کر انھیں دکھاؤ ـــ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ ہو (الانعام ۳۵)

اس کے برعکس کہا گیا کہ یہ قرآن جو اتارا گیا، یہی خدا کی طرف سے معجزہ ہے:

وقالوا لولا انزل علیہ آیٰت من ربہ قل انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین ـ اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلیٰ علیھم ان فی ذلک لرحمۃ وذکری لقوم یومنون (العنکبوت ۵۱۔۵۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس رسول پر نشانیاں کیوں نہ اتریں۔ کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو بس کھول کر سنا دینے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمھارے اوپر قرآن اتارا جو ان پر پڑھا جاتا ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو ماننے والے ہیں۔

قرآن کے معجزہ ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ یہاں ہم خاص طور پر اس کے تین پہلوؤں کا ذکر کریں

گے (۱) عام لسانی تاریخ کے علی الرغم قرآنی زبان کا زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہنا۔ (۲) مذہبی کتابوں کی تاریخ میں قرآن کا یہ استثنار کہ اس کے متن میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ ہوسکا۔ (۳) قرآن کے چیلنج کے باوجود کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوناکہ وہ قرآن کے جواب میں قرآن جیسی ایک کتاب لکھ سکے۔

جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں قرآن ایک حیرت انگیز استثنار ہے، تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہوچکی ہیں. مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی بدستور زندہ ہے۔ آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو لکھتے اور بولتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے قرآن اتارا گیا تھا ——— یہ واقعہ قرآن کے معجزاتی کتاب ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کے سوا ساری انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس نے اپنی اصل زبان کو اس طرح بعد کے زمانوں میں باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قریب العہد مقدس کتاب ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاساً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان غالباً آرامی تھی۔ تاہم انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ آج ہمارے پاس ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ گویا حضرت مسیح کے خیالات صرف ترجمہ شدہ حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان بھی قدیم و جدید یونانی سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے عہد نامہ میں کم از کم ۵۵۰ الفاظ (کل متن کا ۱۲ فی صد) ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ انیسویں صدی میں ایک جرمن عالم اڈولف ڈیزمن (Adolf Deissmann) نے مصر میں بعض قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اس نے قیاس کیا کہ "ببلیکل گریک" دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں رائج تھی۔ اس نے مذکورہ نامعلوم الفاظ کے کچھ معانی متعین کئے۔ تاہم اب بھی یونانی انجیل میں ۵۰ الفاظ (کل متن کا ایک فی صد) ایسے ہیں جن کے معانی ابھی تک نامعلوم ہیں۔

Xavier Leon-Dufour S.J., *The Gospels and The Jesus of History* Desclee Co. Inc., New York 1970, pp. 79-80

ارنسٹ رینان (۱۸۹۲ - ۱۸۲۳) نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اللغات السامیہ میں لکھا ہے:

> "انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ عربی زبان ہے۔ یہ زبان قدیم تاریخ میں ایک غیر معروف زبان تھی۔ پھر اچانک وہ ایک کامل زبان کی حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہوسکی حتی کہ اس کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے اول دن جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔"

قرآن کی زبان کے بارے میں فرانسیسی مستشرق کا یہ اعتراف دراصل اعجاز قرآن کا اعتراف ہے۔ کیونکہ حقیقۃً یہ قرآن کا

معجزاتی ادب ہی ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ رکھا جس سے دوسری تمام زبانیں متاثر ہوئی ہیں۔ مسیحی عالم جرجی زیدان (۱۹۱۴ - ۱۸۶۱) نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

وبالجملة فان للقرآن تاثیرا فی آداب اللغة العربية ليس لكتاب دينی مثله فی اللغات الاخری (آداب اللغات العربیہ)	مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا ہے جس کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں تبدیلی کا شکار رہی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی زبان کا آج کا ایک عالم اس زبان کی چند سو برس پہلے کی کتاب کو لغت اور شرح کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کے اسباب عام طور پر دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک، اجتماعی انقلاب، دوسرے، ادبی ارتقار۔ عربی زبان کے ساتھ پچھلی صدیوں میں یہ دونوں واقعات اسی شدت کے ساتھ پیش آئے جس طرح کسی دوسری زبان کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ مگر وہ اس زبان کے لسانی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ عربی زبان اب بھی وہی زبان ہے جو چودہ سو برس پہلے نزول قرآن کے وقت مکہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہومر (م ۸۵۰ ق م) کی ایلیڈ، تلسی داس (م ۱۶۲۳ء) کی رامائن، اور شیکسپیر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) کے ڈرامے انسانی ادب کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور زمانۂ تالیف سے لے کر اب تک مسلسل پڑھے جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ان زبانوں کو اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے جن میں وہ لکھے گئے تھے۔ ان کی زبانیں اب کلاسیکس کی زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں۔ زبانوں کی تاریخ میں قرآن واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے علمی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت پر باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی سماج کی کوئی بھی تبدیلی اُس میں تبدیلی کا باعث نہ بن سکی۔ یہ واقعہ قرآن کے ایک برتر کلام ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے، اس کے بعد اعجاز قرآن کے لئے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی انقلابات

اجتماعی انقلابات کس طرح زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے لاطینی کی مثال لیجئے۔ لاطینی کا مرکز بعد کے دور میں اگرچہ اٹلی بنا، مگر اصلاً یہ زبان اٹلی کی پیداوار نہ تھی۔ تقریباً ۱۲ سو قبل مسیح، لوہے کا زمانہ آنے کے بعد، جب وسط یورپ کے قبائل اطراف کے علاقوں میں پھیلے تو ان کی ایک تعداد، خاص طور پر کوہ الپ کے قبائل اٹلی میں داخل ہوئے اور روم اور اس کے آس پاس آباد ہوئے۔ ان کی بولی اور مقامی بولی کے ملنے سے جو زبان بنی وہی ابتدائی لاطینی زبان تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لیویس اینڈرونیکس نے یونانی زبان کے کچھ ڈراموں اور کہانیوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس طرح لاطینی زبان ادبی زبان کے دور میں داخل ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے لاطینی کو اپنی سرکاری زبان بنایا، مسیحیت کے پھیلاؤ سے بھی اس کو تقویت ملی۔ اس طرح مذہب اور سیاست نیز سماجی اور اقتصادی زور پر اس کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ قدیم یورپ کے تقریباً پورے علاقہ میں

پھیل گئی۔ سینٹ آگسٹین (۴۳۰ - ۳۵۴) کے زمانے میں لاطینی اپنے عروج پر تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں لاطینی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین اقوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی میں مسلم قومیں ابھریں اور انھوں نے رومی سلطنت کو توڑ کر اس کو قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے وہاں سے بھی اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہزار برس قبل جب رومی شہنشاہیت ٹوٹی تو مختلف علاقائی بولیوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ یہی بولیاں، لاطینی کی آمیزش کے ساتھ بعد کو وہ زبانیں بنیں جن کو آج ہم فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی۔ رومانوی زبانیں کہتے ہیں۔ اب لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادتی زبان ہے اور سائنس اور قانون کی اصطلاحات میں استعمال ہوتی ہے۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) کی پرنسپیا کوئی اصل زبان میں پڑھنا چاہے تو اس کو قدیم لاطینی زبان سیکھنی پڑے گی۔

یہی معاملہ تمام قدیم زبانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زبان ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری بدلی ہوئی زبان نے لے لی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آتے ہیں تو وہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ یہی تمام حالات پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس تغیر پذیر لسانی دنیا میں عربی کا غیر تغیر پذیر رہنا تمام تر قرآن کا معجزہ ہے۔

۷۰ء میں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب (مدینہ) آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی۔ عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہو گئی۔ تاہم ان کی عربی عام عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عبری اور عربی کا ایک مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن عرب سے نکلے اور ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں داخل ہوئے جہاں کی زبانیں دوسری تھیں۔ مگر اس اختلاط کا کوئی اثر ان کی زبان پر نہیں پڑا۔ عربی بدستور اپنی اصل حالت پر محفوظ رہی۔

نزولِ قرآن کے بعد عربی زبان کے لئے اس قسم کا پہلا موقع خود صدرِ اول میں پیش آیا۔ اسلام عرب کے مختلف قبائل میں پھیلا۔ وہ لوگ اسلامی شہروں میں یک جا ہونے لگے۔ مختلف قبائل کی زبانیں تلفظ، لب و لہجہ وغیرہ کے اعتبار سے کافی مختلف تھیں۔ ابو عمرو بن العلاء کو کہنا پڑا تھا: مالسان حمیر بلساننا ولا لغتہم بلغتنا (قبیلہ حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے) حضرت عمر نے ایک بار ایک اعرابی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو پکڑ کر آنحضور کے پاس لائے۔ کیونکہ وہ الفاظِ قرآن کو اتنے مختلف ڈھنگ سے ادا کر رہا تھا کہ حضرت عمر یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ قرآن کا کون سا حصہ پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح آنحضور نے ایک بار ایک عرب قبیلہ کے وفد سے اس کی اپنی بولی میں گفتگو کی تو حضرت علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے آپ کوئی اور زبان بول رہے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ لہجوں کا اختلاف تھا۔ مثلاً بنو تمیم جو مشرقی نجد میں رہتے تھے، وہ جیم کا تلفظ یا سے کرتے تھے۔ وہ

مسجد کو مسید اور شجرات کو سرات کہتے تھے۔ اسی طرح بنو تمیم ق کو جیم بولتے تھے۔ مثلاً طریق کو طریج، صدیق کو صدیج، قدر کو جدر اور قاسم کو جاسم وغیرہ۔ اس طرح مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام قانون کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہئے تھا جو بالآخر ایک نئی زبان کی تشکیل پہ منتج ہوتا۔ مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس وہ واقعہ پیش آیا جس کو ڈاکٹر احمد حسین زیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ما کانت لغة مضر بعد الاسلام لغة امة واحدة وانما کانت لغة لجمیع الشعوب التی دخلت فی دین الله

اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی۔ بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

پھر یہ عرب مسلمان اپنے ملک سے باہر نکلے۔ انھوں نے ایک طرف جبل الطارق تک اور دوسری طرف کاشغر تک فتح کر ڈالا۔ ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ وہ فارسی، قبطی، بربری، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی، آرامی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور اپنے تمدن میں عربوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ ان کا ایران سے اختلاط ہوا جو اس وقت کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں میں سے ایک تھا۔ ان کا تصادم رومی تہذیب اور عیسائی مذہب سے ہوا جو زبردست ترقی کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا سابقہ شام سے پیش آیا جہاں فینیقی، کنعانی، مصری، یونانی، غسانی قوموں نے اپنے آداب و اطوار کے نمایاں اثرات چھوڑے تھے۔ ان کا مقابلہ مصر سے ہوا جہاں مشرق و مغرب کے فلسفے آکر ملے تھے۔ یہ اسباب بالکل کافی تھے کہ عربی میں ایک نیا عمل شروع ہو اور ابتدائی زبان کے ساتھ ان نئے عوامل کے اثر سے ایک اور زبان وجود میں آجائے جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا۔ مگر اتنے بڑے لسانی بھونچال کے باوجود قرآن اس زبان کے لئے ایک ایسا برتر معیار بنا رہا جس نے تمام دوسرے عوامل کو اس کے لئے بے حقیقت بنا دیا۔

اسلام کی فتوحات کے بعد عربی زبان صرف ایک ملک کی زبان نہ رہی بلکہ کئی درجن ملکوں اور قوموں کی زبان بن گئی۔ ایشیا اور افریقہ کی عجمی اقوام نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی زبان بھی دھیرے دھیرے عربی بن گئی۔ فطری طور پر ان غیر ملکی اقوام میں عربی زبان بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی۔ ان کی زبان میں اپنی غیر عربی زبانوں کے اثر سے بہت سی خامیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ خود عربوں میں جو لوگ زیادہ باشعور نہ تھے دھیرے دھیرے وہ ان قوموں سے اثر لینے لگے۔ یہاں تک کہ خود ان کی زبان بدلنا شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ غلطیاں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ یہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ خرابی خواص تک پہنچ گئی۔ زیاد بن امیہ کے دربار میں ایک بار ایک شخص آیا اور بولا: توفی ابانا وترک بنون (ہمارا باپ مرگیا اور اولاد چھوڑ گیا) اس جملہ میں ابانا کی جگہ ابونا ہونا چاہئے تھا اور بنون کی جگہ بنین۔ اس طرح کے بے شمار فروق پیدا ہو گئے۔ دیگر تاریخی زبانوں

کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہی عربی زبان کے ساتھ بھی لازماً ہوتا۔ مگر یہاں بھی قرآن کی ادبی عظمت عربی کے لئے ڈھال بن گئی اور عربی زبان کی صورت پھر بھی وہی باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دی تھی۔

اس طرح کے واقعات جو عربی زبان کی پچھلی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں قرآن کے معجزہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ کیونکہ یہ تمام تر قرآن کی عظمت ہی کا نتیجہ تھا جس نے عربی کو کسی تغیری عمل کا معمول بننے نہ دیا۔

دوسری صدی ہجری میں اموی سلطنت کا خاتمہ اور عباسی سلطنت کا قیام عربی زبان کے لئے زبردست فتنہ تھا۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکمراں عرب قومیت اور عربی زبان وادب کی حمایت میں جانب داری اور تعصب کی حد تک سخت تھے۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دمشق کو بنایا تھا جو عرب دیہات کی سرحد پر واقع تھا۔ ان کی فوج، دفتری عملہ اور افسران سب عرب ہوا کرتے تھے۔ مگر عباسی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہوگیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد سے بنی امیہ کا خاتمہ کیا تھا، اس لئے ان کے نظم ونسق میں ایرانی اعاجم کا عمل دخل ہو جانا لازمی تھا، حتیٰ کہ عباسیوں نے دارالخلافہ بغداد کو قرار دیا جو ایران سے بہت قریب تھا۔ انھوں نے ایرانیوں کو اتنی چھوٹ دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزادانہ کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالقصد کمزور کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ عربی عصبیت کے کمزور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت اور سماج کے تمام معاملات پر چھا گئے۔ عربوں اور غیر عربوں میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ آریائی تہذیب اور سامی تہذیب کے ملنے سے زبان اور تہذیب میں نیا انقلاب آگیا۔ اکاسرہ کے پوتے اور قدیم جاگیرداروں کے بیٹے پھر سے ابھر آئے۔ انھوں نے اپنے آبا واجداد کی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ان واقعات کا عربی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ متنبی (۹۱۵ - ۹۶۵ء) کے زمانہ میں عربی کی جو حالت ہو چکی تھی، اس کا اندازہ اس کے چند اشعار سے ہوتا ہے:

مَغانی الشِّعبِ طِیباً فی المغانی	بمنزِلَۃِ الربیعِ مِنَ الزَّمانِ
ولکنَّ الفتیَ العربیَّ فیہا	غریبُ الوجہ والید واللسانِ
مَلاعِبُ جِنَّۃٍ لو سارَ فیہا	سلیمان لسار بترجمان

شرح دیوان المتنبی (بیروت ۱۹۳۸) صفحہ ۴۳۸

"شعب بوان (ایران) کے مکانات عمدگی میں تمام مکانوں سے اسی طرح بڑھے ہوئے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں بہار کی فصل۔ مگر اس بستی میں ایک عرب جوان (میں) اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہے۔ سلیمان جن کے تابع جنات تھے (جو جانوروں تک کی بولیاں سمجھتے تھے) اگر اس علاقہ میں آئیں تو انھیں اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا" ——— ترکوں اور کردوں نے بھی اس سلسلے میں ایرانیوں کی تقلید کی۔ مگر قرآن کی ادبی عظمت عربی زبان کے لئے ڈھال بنی رہی۔ اس قسم کی کوششوں سے وقتی ہلچل تو ضرور پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ دب کر رہ گئی اور عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔

خلیفہ متوکل (۲۴۷ـــ ۲۰۶ھ) کے بعد عجمی اقوام، ایرانی اور ترک، عرب علاقہ میں بہت زیادہ دخیل ہو گئے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کی سلطنت کو برباد کر دیا۔ ۸۹۸ھ میں اندلس کی عرب حکومت کو یورپی اقوام نے ختم کر دیا۔ ۹۲۳ھ میں مصر و شام سے فاطمیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان عرب علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اسلامی حکومت کا دارالسلطنت قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ ہو گیا۔ سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی قرار پائی۔ عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ اور اسالیب کثرت سے آنے لگے۔

عالم عرب پر ساڑھے پانچ سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام عرب دنیا عجمی بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے رہی، حتیٰ کہ مغل، ترک اور ایرانی حکمراں عرب آثار تک کو مٹانے پر تلے رہے۔ عربی کے کتب خانے جلائے گئے، مدرسے اجاڑے گئے، علماء کو ذلیل کیا گیا۔ عثمانی سلطنت نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ عربوں کو ترک بنانے کی وہ مہم چلائی جس کو جمال الدین افغانی نے بجا طور پر "تتریک العرب" کہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی قوموں نے عربی زبان و ادب اور عرب تہذیب کو جو نقصانات پہنچائے وہ عربی زبان کا نام و نشان مٹانے کے لئے بالکل کافی تھے۔ اس کے بعد، دوسری زبانوں کی تاریخ کے مطابق، یہ ہونا چاہئے تھا کہ عربی زبان اپنی دیگر سامی زبانوں سے مل جاتی۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوا ہوتا تو عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔

تاہم جہاں تک عرب علاقہ کا تعلق ہے، وہاں اس کا بدستور اپنی سابقہ شان میں باقی رہ جانا تمام تر قرآن ہی کا معجزہ تھا۔ قرآن کی عظمت نے اس مدت میں لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ عربی زبان سے اپنا تعلق حکومت و اقتدار کے علی الرغم باقی رکھیں یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی بے شمار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان و ادب کی خدمت کی۔ مثال کے طور پر ابن منظور (۶۳۰ – ۷۱۱ھ) ابن خلدون (۷۳۲ – ۸۰۸ھ) وغیرہ۔

نپولین کے قاہرہ میں داخلہ ۱۷۹۸ء کے بعد جب مصر میں پریس آیا اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو عربی زبان کو نئی زندگی ملی تاہم پچھلے سیکڑوں برس کے حالات نے یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مصر و شام کے دفاتر کی زبان ترکی و عربی کا ایک مرکب تھا۔

۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پھر صورت حال بدلی۔ انھوں نے عربی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی۔ تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کر دی گئی۔ مختلف زبانیں سکھانے کے ادارے ختم کر دیے گئے۔ اسی طرح جن عرب علاقوں پر فرانسیسیوں کا غلبہ ہوا، وہاں انھوں نے فرانسیسی کو رواج دیا۔ مگر تقریباً سو سال تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے غلبہ کے باوجود عربی زبان بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ اس میں الفاظ کی وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر ٹینک کے لئے دبابہ کا لفظ رائج ہوا جو پہلے معمولی منجنیق کے لئے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح طرز بیان میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثلاً نومسلموں کے حالات پر آج ایک کتاب شائع ہو تو اس کا نام رکھا جاتا ہے لماذا اسلمنا۔ جب کہ اس سے پہلے مسجع و مقفیٰ ناموں کا رواج تھا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ معرب ہو کر رائج ہوئے مثلاً دکتور (ڈاکٹر)۔ مگر اس سے

اصل زبان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل زبان بدستور وہی آج بھی ہے جو قرآن کے نزول کے وقت مکہ میں رائج تھی۔

ادبی ارتقاء

زبانوں میں تبدیلی کا دوسرا سبب ادیبوں اور مصنفوں کے کارنامے ہیں۔ جب بھی کوئی غیر معمولی ادیب یا مصنف پیدا ہوتا ہے، وہ زبان کو کھینچ کر نئے لسانی اسلوب کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان تبدیلی اور ارتقاء کے مراحل طے کرتی رہتی ہے، اور بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں، اس کے برعکس، ایسا ہوا کہ قرآن نے اول روز ہی ایسا برتر معیار سامنے رکھ دیا کہ کسی انسانی ادیب کے لئے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس سے اوپر جا سکے۔ اس لئے عربی زبان اسی اسلوب پر باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، عربی زبان میں قرآن کے بعد کوئی دوسرا "قرآن" نہ لکھا جا سکا۔ اس لئے زبان بھی قرآنی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ بن سکی۔

انگریزی زبان کی مثال لیجئے۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں کسی علمی خیال کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ پانچ سو برس سے بھی زیادہ عرصہ تک یہی حال رہا۔ انگریزی زبان کا معمار اول جافرے چاسر (۱۴۰۰ - ۱۳۴۰) پیدا ہوا تو انگلستان کی درباری زبان فرانسیسی تھی۔ چاسر جو لاطینی، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتا تھا، اس نے انگریزی میں اشعار کہے اور نظمیں لکھیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور دیگر زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو سکا کہ انگریزی بولی کو آگے لے جائے اور اس کو ایک علمی زبان کا روپ دے۔ ہاسر (Ernest Hauser) کے الفاظ میں اس نے اپنی کامیاب نظموں کے ذریعہ انگریزی کو ایک مضبوط بڑھاوا (Firm Boost) دیا۔ اس نے ایک بولی کو ایسی طاقتور زبان بنا دیا جس میں ترقی کے نئے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ۔ جون ۱۹۷۵)

دو سو برس تک چاسر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا رہنما بنا رہا۔ یہاں تک کہ ولیم شکسپیر (۱۶۲۵ - ۱۵۵۸) کا ظہور ہوا جس نے چاسر سے زیادہ برتر ادب کا نمونہ پیش کیا۔ اپنے اشعار اور ڈراموں کے ذریعہ اس نے انگریزی کو دوبارہ ایک نیا معیار عطا کیا۔ اب انگریزی زبان ایک قدم اور آگے بڑھی اور ترقی کی نئی شاہراہ پر سفر کرنے لگی۔ یہ دور تقریباً ایک سو برس تک رہا، یہاں تک کہ سائنس کے ظہور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی، دوبارہ نئے معیار قائم کرنے شروع کئے۔ اب شعر کے بجائے نثر، اور افسانہ نویسی کے بجائے واقعہ نگاری کو اہمیت ملنے لگی۔ اس کے اثر سے انگریزی میں سائنٹفک اسلوب وجود میں آیا۔ سویفٹ (۱۷۴۵ - ۱۶۶۷) سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (1888-1965) تک درجنوں ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے زبان کو وہ نیا معیار عطا کیا جس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔

یہی عمل تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا زیادہ بہتر لکھنے والا ادیب یا ادیبوں کا گروہ اٹھتا ہے اور وہ زبان کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ اگلے لوگ پچھلی زبان کو لغات اور شرح کے بغیر سمجھ ہی نہ سکیں۔

اس کلیہ سے صرف ایک زبان مستثنیٰ ہے اور وہ عربی زبان ہے۔ یہی واقعہ قرآن کے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ کوئی شخص قرآن جیسی کتاب وضع نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پچھلی صدیوں میں

متعدد لوگوں نے قرآن کے جواب میں دوسرا قرآن لکھنے کی کوشش کی، مگر سب کے سب ناکام رہے۔ مثال کے طور پر مسیلمہ بن حبیب، طلیحہ بن خویلد، نضر بن الحارث، ابن الراوندی، ابو العلاء المعری، ابن المقفع، متنبی وغیرہ۔ اس سلسلے میں ان کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں، وہ اتنی سطحی ہیں کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کو رکھنا بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مسیلمہ کے "قرآن" کا ایک حصہ یہ تھا:

یا ضفدع نقی ما تنقین، فلا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین

اے مینڈکی جتنا ٹرا سکے ٹرالے، تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والوں کو روکے گی۔

اسی طرح مسیلمہ کا ایک اور "الہام" یہ تھا:

لقد انعم اللّٰہ علی الحبلی، اخرج منہا نسمۃ تسعی، من بین صفاق وحشا

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۲۱

اللہ نے حاملہ عورت پر بڑا انعام کیا ہے، اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی جان نکالی، جھلی اور پیٹ کے اندر سے

تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا ثبوت وہ مسلسل واقعہ ہے جس کو ارنسٹ رینان نے ایک لسانی عجوبہ قرار دیا ہے۔ جس طرح دوسری زبانوں میں زبان آور پیدا ہوئے، اسی طرح عربی میں بھی شعراء اور ادباء اور مصنفین پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں، مگر اس پوری مدت میں کوئی ایسا زباں داں نہ اٹھا جو قرآن سے برتر ادب پیش کر کے عربی میں نیا لسانی معیار قائم کرتا اور زبان کو نئے مرحلہ کی طرف لے جاتا۔ اس لئے زبان اسی مرحلۂ ترقی پر قائم رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اگر دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے جو قرآن کے مقابلہ میں زیادہ اعلیٰ ادب کا نمونہ پیش کرتے تو ناممکن تھا کہ زبان ایک مقام پر رکی رہے۔

قرآن کی مثال عربی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے کسی زبان میں آخری اعلیٰ ترین ادیب اول روز ہی پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی ایسا ادیب نہیں ابھرے گا جو زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں جو زبان عرب میں رائج تھی، اس کو ترقی دے کر قرآن نے اعلیٰ ترین ادب کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہ تھا۔

قرآن نے عربی کے روایتی اسالیب پر اضافے کر کے اس میں توسیع کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر سورہ اخلاص میں لفظ "احد" کا استعمال۔ عربی زبان میں اس سے پہلے یہ لفظ مضاف مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا آیا تھا جیسے یوم الاحد (ہفتے کا دن) یا نفی عام کے لئے جیسے ما جاءنی احدٌ (میرے پاس کوئی نہیں آیا) وغیرہ مگر قرآن نے یہاں لفظ احد کو ہستی باری تعالیٰ کے لئے وصف کے طور پر استعمال کیا جو عربی زبان میں غیر معمولی تھا۔ عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کئے۔ مثلاً استبرق (فارسی) قسورہ (حبشی) صراط (یونانی) یم (سریانی) غساق (ترکی) قسطاس (رومی) ملکوت (آرامی) کافور (ہندی) وغیرہ۔ مکہ کے مشرکین نے جب کہا تھا کہ وما الرحمٰن (فرقان - ٦٠) تو اس کا لسانی پس منظر یہ تھا کہ رحمان کا لفظ عربی نہیں یہ سبائی اور حمیری زبان سے آیا ہے۔ یمن اور حبشہ

کے نصرانی اللہ کو رحمٰن کہتے تھے۔ قرآن نے اس لفظ کی تعریب کرکے اس کو اللہ کے لئے استعمال کیا تو مکہ والوں کو وہ اجنبی محسوس ہوا۔ انھوں نے کہا "رحمان کیا"۔ قرآن میں غیر عربی الاصل الفاظ ایک سو سے زیادہ شمار کئے گئے ہیں جو فارسی، رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی قبطی وغیرہ زبانوں سے لئے گئے ہیں۔

قرآن اگرچہ قریش کی زبان میں اترا۔ مگر دوسرے قبائل عرب کی زبان بھی اس میں شامل کی گئی۔ مثلاً قرآن میں "فاطر" کا لفظ آیا ہے، عبداللہ بن عباسؓ جو ایک قریشی مسلمان تھے، کہتے ہیں:

ماکنت ادری معنی رفاطر السماوات والارض	میں فاطر السماوات والارض کے معنی نہیں سمجھتا تھا
حتی سمعت اعرابیا یقول لبئر ابتدأ حفرھا :	یہاں تک کہ ایک اعرابی جس نے ایک کنواں کھودنا شروع
انا فطرتہا	کیا تھا، کہا' انا فطرتُھا۔ تب میں اس کو سمجھا۔

ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں:

ماسمعت السکین الا فی قولہ تعالیٰ (یوسف - ۳۱)	میں نے سکین (چھری) کا لفظ پہلی بار قرآن کی آیت
ماکنا نقول الا المدیۃ	سے جانا۔ اس سے پہلے ہم اس کو مدیہ کہا کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ایسے تھے جن کے مختلف لہجے عرب قبائل میں رائج تھے۔ قرآن نے ان میں سے فصیح تر لفظ کا انتخاب کرکے اس کو اپنے ادب میں استعمال کیا۔ مثلاً قریش کے یہاں جس مفہوم کے لئے اعطیٰ کا لفظ تھا اس کے لئے حمیرین کے یہاں انطیٰ بولا جاتا تھا۔ قرآن نے انطیٰ کو چھوڑ کر اعطیٰ کا انتخاب کیا۔ اسی طرح شناتر کی جگہ اصابع کتع کی جگہ ذنب وغیرہ۔ قرآن اصلاً قریش کی زبان میں اترا ہے مگر بعض مقامات پر قریش کی زبان کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لا یلتکم من اعمالکم بنی عبس کی زبان ہے۔ (الاتقان)

اس طرح قرآن نے الفاظ اور اسالیب کو نئی وسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ قائم کر دیا۔ یہ نمونہ اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد کوئی ادیب اس سے برتر معیار پیش نہ کر سکا۔ اس لئے عربی زبان ہمیشہ کے لئے قرآن کی زبان ہو کر رہ گئی۔

عربوں میں جو امثال اور تعبیرات قدیم زمانہ سے رائج تھیں، ان کو قرآن نے زیادہ بہتر پیرایہ میں ادا کیا۔ مثلاً زندگی کی بے ثباتی کو قدیم عربی شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

کل ابن انثی وان طالت سلامتہ　　یوما علی آلۃ حدباء محمول

ہر آدمی خواہ وہ کتنی ہی عرصہ تک صحیح وسالم رہے، ایک دن بہرحال وہ تابوت کے اوپر اٹھایا جائے گا۔

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران — ۱۸۵)

قدیم عرب میں قتل وغارت گری سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس صورت حال نے چند فقرے پیدا کئے تھے جو اس زمانہ میں فصاحت کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے حسب ذیل مختلف الفاظ میں موزوں کیا تھا:

قَتْلُ الْبَعْضِ اِحْيَاءٌ لِلْجَمِيْعِ — بعض لوگوں کا قتل سب کی زندگی ہے
اَکْثِرُوا الْقَتْلَ لِیَقِلَّ الْقَتْلُ — قتل کی زیادتی کرو تاکہ قتل کم ہو جائے۔
اَلْقَتْلُ اَنْفیٰ لِلْقَتْلِ — قتل کو سب سے زیادہ روکنے والی چیز قتل ہے

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیَاۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَاب (بقرہ - ۱۷۹)

قرآن سے پہلے عربی میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں شعر کو بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ شعر کے اسلوب میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا کمال سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس عام روش کو چھوڑ کر نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ ساتویں صدی کی دنیا میں صرف خدائے لم یزل ہی اس بات کو جان سکتا تھا کہ انسانیت کے نام ابدی کتاب بھیجنے کے لئے اسے نثر کا اسلوب اختیار کرنا چاہئے نہ کہ شعر کا، جو مستقبل میں غیر اہم ہو جانے والا ہے۔ اسی طرح پہلے کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ کہنا ادب کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا۔ پہلے جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، سائنس، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ پہلے قصہ کہانی میں بات کہی جاتی تھی، قرآن نے براہ راست اسلوب کو اختیار کیا۔ پہلے قیاسی منطق کو ثبوت کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، قرآن نے علمی استدلال کی حقیقت سے دنیا کو باخبر کیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ساری چیزیں قرآن میں اتنے بلند اسلوب کلام میں بیان ہوئیں کہ اس کے مثل کوئی کلام پیش کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔

قدیم عرب میں یہ مقولہ تھا کہ ان اعذب الشعر اکذبہ (سب سے زیادہ میٹھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو) مگر قرآن نے ایک نیا طرز بیان (رحمٰن - ۴) پیدا کیا جس میں فرضی مبالغوں کے بجائے واقعیت تھی، اس نے حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کیا۔ قرآن عربی زبان و ادب کا حاکم بن گیا۔ ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے، وہ سب قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے اور اس کو سمجھنے کے لئے جمع کیا گیا۔ اسی طرح صرف ونحو، معانی وبیان، لغت وتفسیر، حدیث وفقہ، علم کلام، سب قرآن کے معانی ومطالب کو حل کرنے اور اس کے اوامر و نواہی کی شرح کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ وجغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن کے احکام وہدایت کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی ـــــ قرآن کے سوا تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں کہ کسی ایک کتاب نے کسی قوم کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہو۔

قرآن نے عربی زبان میں تصرف کرکے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا، وہ اتنا ممتاز اور بدیہی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کرکے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کا الٰہی ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم مثال کے لئے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

"۱۳؍ جون ۱۹۳۲ کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی۔ انھوں نے ایک عجیب واقعہ

بیان کیا۔ انھوں نے کہا، میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ادبی رشتہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا "کیا تم بھی انھیں لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں" یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عقیدہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جارہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کا کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کر سکتے ہیں۔ تجربہ کرکے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ویسا کلام تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے استاد فنکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں۔ وہ تصور یہ کہ "جہنم بہت وسیع ہے"۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر "تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جملے یہ تھے:

ان جهنم واسعة جدا

ان جهنم لاوسع مما تظنون

ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان

ان جهنم لتسع الدنيا كلها

ان الجن والانس اذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم

كل وصف في سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئ من حقيقتها

ان سعة جهنم لتصغر امامها سعة السماوات والارض

كل ما خطر ببالك في سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع

سترون من سعة جهنم ما لم تكونوا لتحلموا به او تتصوروه

مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصر لن تصل الى شئ من حقيقتها

ان البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز اشد العجز عن وصف سعة جهنم

ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين

متى امسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك

ان سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدور بحسبان

كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذيان

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کر چکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لئے الفاظ نہ رہے تو میں نے

پروفیسر فنکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی"۔ میں نے کہا "جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کرکے اس مفہوم کے لئے اپنی عبارتیں تیار کرچکے ہیں۔ پروفیسر فنکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا، قرآن میں کیا ہے۔ میں نے سورہ ق کی یہ آیت پڑھی: يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ۔ یہ سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران گئے، انھوں نے کہا:

صدقت نعم صدقت وانا اقر بذلك مغتبطا من كل قلبي۔

آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں۔

میں نے کہا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کرلیا۔ کیوں کہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو پورا اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا لٹریچر کے مطالعہ میں اس نے اپنی عمر صرف کردی تھی"۔

الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر ۱۳۵۱ھ، جز ۲۳، صفحات ۱۲-۱۱۱

افغانستان پر روسی جارحیت اور مؤتمر المصنفین کی اہم پیشکش

روسی الحاد

پس منظر و پیش منظر

تالیف واشاعت ———— مؤتمر المصنفین

سوشلزم اور کمیونزم حریت اقوام، آزادی افکار کا غاصب اور دیگر مذاہب کا عظیم دشمن اور انسانی و اخلاقی قدروں کا کن کن طریقوں سے باغی ہے؟ ان سب باتوں کا جواب اور کمیونزم کی فکری نشوونما، جنگ اقتدار، مظالم اور چیرہ دستیوں سے متعلق کے ناپاک عزائم کا تحقیقی اور تفصیلی جائزہ۔

اہم ابواب کی ایک جھلک جبکہ ہر باب کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے

۱۔ محرکات وعوامل
۲۔ سوشلزم کا فکری سفر
۳۔ عملی سرگرمیاں اور جنگ اقتدار
۴۔ سوشلزم کی چیرہ دستیاں
۵۔ مذہب و اخلاق دشمنی
۶۔ سامراجی تسلط۔ روس اور افغانستان، پاکستان اور سوشلزم

افغانستان پر ظالمانہ یلغار کے بعد روس پاکستان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ آئیے عملی جہاد کے ساتھ ساتھ علمی وفکری جہاد کیلئے بھی کمربستہ ہوجائیں — ایک بھیانک اور مکروہ چہرہ جسکو بے نقاب کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے —

بلاشبہ اس موضوع پر ایک مستند اور تحقیقی کتاب

جس کیلئے صدہا ماخذ کو کھنگالا گیا ہے

قیمت ۱۴ روپے صفحات ۲۰۰ کاغذ و طباعت عمدہ۔ تبلیغ کے لئے ۵ نسخوں پر ۳۳ فیصد رعایت

آج ھی طلب فرمائیں

مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور پاکستان

مؤتمر المصنفین کی ایک تازہ تاریخی پیشکش

قادیان سے اسرائیل تک

تالیف واشاعت ———— مؤتمر المصنفین

" قادیانیت مذہبی سے زیادہ ایک اسلام دشمن سامراجی سیاسی تنظیم ہے، برطانوی سامراج اور یہودی صیہونیت نے اس سیاسی تحریک کو عالم اسلام کے خلاف کیسے کیسے استعمال کیا؟ اسرائیل کے قیام میں اس کا کردار کیا تھا؟ ایسے تمام مخفی گوشوں کا پہلی بار جامع مستند اور مدلل انداز میں تحقیقی جائزہ"

کتاب کے تیرہ ابواب کی ایک جھلک ہر باب کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے

۱۔ سیاسی تحریک مذہبی بہروپ
۲۔ یہودی مسیح موعود
۳۔ سامراجی صیہونی آلہ کار
۴۔ حکیم نورالدین کا دور
۵۔ سیاسیات دور ثانی
۶۔ مرزا محمود کی لندن یاترا
۷۔ لندن منصوبے کی تکمیل
۸۔ نئے مبلغ نئے فتنے
۹۔ عالمی استعمار کے گماشتے
۱۰۔ جنگ عظیم اور قادیانی تحریک کار
۱۱۔ تحریک پاکستان اور قادیان
۱۲۔ اقوام متحدہ اور مسئلہ فلسطین
۱۳۔ یہودی ریاست کے سائے میں

بلاشبہ اس موضوع پر پہلی ایسی مستند اور محققانہ کتاب

جس کیلئے

صدہا قادیانی غیر قادیانی اور یورپی مآخذ کو کھنگالا گیا ہے۔

آج ہی طلب فرمائیں — تبلیغ کے لئے دس نسخے طلب کرنے والوں کو ۳۳ فی صد رعایت۔

قیمت: ۲۰/- روپے، صفحات: ۲۲۴، کاغذ: عمدہ، طباعت: ویذائیک/آفسٹ، ٹائیٹل جدید طرز

مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

—— پاکستان ——

ADARTS HSF-1/82

مولانا لطافت الرحمان سواتی
جامع اسلامیہ بہاولپور

علامہ شمس الحق افغانیؒ

ایک جامع کمالات شخصیت

کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذو الجلال والاکرام۔ یعنی تمام اولادِ آدم کو موت سے دوچار ہونا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ کو حضرت کعب نے یوں بیان کیا ہے ؎

کل ابن حوا وان طالت سلامتہٗ

یوماً علی آلۃٍ حدباء محمول

یعنی حضرت حوّا کی تمام اولاد کو (اگرچہ ان میں سے کوئی شخص دیر تک زندہ رہے) لیکن ایک دن مرنا ہے۔ چنانچہ بالآخر حضرۃ الاستاذ المعظم الشیخ المغفور لہٗ العلامہ شمس الحق افغانیؒ بھی وفات پا گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً فی مساوی منہ وکرمہ وادر علی قبرہ شابیب فضلہ ورضوانہ ؎

آمین آمین لا ارضی بواحدۃ

حتی ضم الیہا الف آمینا

میں تعطیلات گرما کے دوران اپنے گھر واقع روئیاں سوات میں تھا کہ ۱۴ اگست مغرب کے وقت کسی نے ریڈیو کے ذریعہ حضرت افغانیؒ کی وفات کی خبر دی اور میرے لئے یہ خبر جس قدر صدمہ و رنج کا ذریعہ بنی اس کے بارہ میں میں وہی کچھ کہہ سکتا ہوں جو حضرت مدنیؒ نے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پہ فرمایا تھا کہ ؎

حالِ ما در سوزِ حسرت کم تر از یعقوب نیست　　او پسر گم کردہ بود و ما پدر گم کردہ

بہرحال ۱۷ کی صبح میرا چھوٹا بیٹا برخوردار کفایت اللہ مجھے کار میں لے گیا۔ بس جسے ہم ترنگزئی پہنچ گئے۔ وہاں تعزیت کو آنے والوں کے ہجوم در ہجوم آرہے تھے۔ استاد مرحوم کے تینوں سوگوار اور غمزدہ بیٹے حافظ نور الحق صاحب، مطیع الحق صاحب، داؤد صاحب ملے۔ ان سے تعزیت کے بعد ہم حضرت کی مرقد کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے، وہاں ایک عظیم شخصیت محوِ خواب تھی۔ اس وقت تو خیر اس ناکارہ کا جو حال تھا وہ تو

تھا ہی مگر اب بھی یہ حال ہے کہ جہاں کسی قبر پر نظر پڑتی ہے تو حضرت الاستاذ المرحوم کی قبر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور اس طرح عرب شاعر متمم بن نویرہ کی وہ کہانی یاد آتی ہے۔ جو اس نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے مرنے اور ہر قبر پر رونے کے سلسلہ میں ذیل کے تین شعروں میں بیان کیا ہے ؎

لقد لامنی عند القبور علی البکا
رفیقی لتذراف الدموع السوافك
فقال اتبکی کل قبر رأیته
لقبر ثوی بین اللوی فالدکادك
فقلت له ان الشجی یبعث الشجی
فدعنی فهذا کله قبر مالك

مرحوم کی وفات پر مقالہ لکھ کر وابستہ تاثرات کی یادوں کو مقدور بھر قلمبند کرنا تو میرا فریضہ تھا ہی مگر اسکی فرمائش بھی جن احباب کیطرف سے ہوئی ان میں خاص طور پر برادرم مولانا سمیع الحق صاحب کی فرمائش کی تعمیل تو میرے لئے بہت ہی مشکل ہے جو فرماتے ہیں کہ :

"—— بلکہ واقعۃً آپ اس کے اہل ہیں کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، دینی اور سیاسی و ملکی اور ملی خدمات پر ایک اہم جاندار مقالہ الحق کے لئے لکھیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت افغانیؒ کا آپ پر یہ حق ہے کہ آپ، ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو واضح کریں۔"

جب کہ ظاہر ہے کہ حضرۃ المرحوم کی زندگی کے وسیع تر گوشوں اور ہر طرح کے بلند و عظیم کارناموں کو مجھ جیسے بے علم کم مایہ اور غافل و جاہل آدمی کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بھلا کہاں لطافت الرحمٰن اور کہاں حضرت افغانیؒ کی حیات مقدسہ کے بحر ذخار میں غوطہ زنی ؟

تاہم "مالا یدرك كله لا یترك كله" کے تحت، ذیل میں چند ٹوٹے پھوٹے کلمات قلمبند کر رہا ہوں اور ہر چند کہ میرے دل و دماغ میں کچھ آب و تاب تو نہیں ہے۔ لیکن مرحوم کے ایک ادنیٰ خادم ہونے کے ناطے ذیل کا جہد المقل پیش کرتا ہوں ؎

آوارہ گشتہ ام مگر امشب نظارہ را پیوند کردہ ام جگر پارہ پارہ را

ولادت و وفات | مرحوم کی ولادت ترنگزئی میں ۵ ستمبر ۱۹۰۱ء کو ہوئی ہے۔ اور وفات ۱۶ اگست ۸۳ ۱۹ء کو واقع ہوئی ہے۔ اس سے آگے آپکی زندگی پر جو مختصر اور بھرپور تبصرہ برادرم مولانا سمیع الحق صاحب نے الحق شمارہ ماہ اگست ۱۹۸۳ء کے نقش آغاز میں کیا ہے اس پر مزید لکھنا یا اس کو دوسرے الفاظ

اور عبارات میں پیش کرنا نامناسب سا لگتا ہے۔ اور یہاں اس نقش آغاز کو بلفظہٖ اس مقالے کا حصہ بنانا بھی لاحاصل تطویل ہے۔ اندریں حالات گویا حضرت افغانیؒ کی زندگی کا خلاصہ حال تو اس نقش آغاز میں پڑھا جائے اور باقی جو کچھ اس ناکارہ کے قلم سے ہو سکا ہے وہ پیش خدمت ہے۔ اور حضرتؒ کی زندگی کے متعلق یہ پیش شدہ چند امور بھی کوئی خاص چیز نہیں۔ بلکہ ؎

میں نے اپنے آشیانہ کے لئے جو چبھے دل میں وہ تنکے چن لئے

کے مصداق ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

ولو ان لی فی کل منبت شعرۃٍ
لساناً لما استوفیت حق ثناۂٖ

بہرحال اکابر علماء حق میں مرحوم کا جو مقام تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے جس علمی تبحر، وسعت اور بے پناہ صلاحیت و قابلیت اور جامعیت سے نوازا تھا اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت کا کام نہیں ہے۔ بلکہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اس رجل عظیم، علامہ دہر، نابغۂ عصر کے فضل و کمال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کے سانحہ وفات پر ریڈیو، اخبار، ٹیلیویژن کی سطح پر سرکاری و غیر سرکاری طور سے آپ کی تعزیتوں میں آپکو جن اوصاف و القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ بہت بڑے سکالر تھے۔ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے۔ وغیرہ وغیرہ — میرے خیال میں یہ تمام تر ستائش و توصیف، ثناء و تعریف اگرچہ متعلقہ حضرات کی جانب سے نہایت عقیدت و احترام اور تعظیم و اکرام کا اظہار ہے۔ لیکن درحقیقت ان سب باتوں سے مرحوم کی علمی عظمت کا عشر عشیر بھی ظاہر ہونا نہیں پاتا۔ جس طرح کہ ایک زبردست تلوار کو لاٹھی سے تیز اور زوردار بتانا تلوار کی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی تنقیص ہے۔ جیساکہ شاعر نے کہا ہے کہ ؎

الم تر ان السیف ینقص قدرہٗ
اذا قیل ھذا السیف امضیٰ من العصا

الغرض مرحوم جس قدر صاحب علم و فضل اور جس قدر تمام علوم اسلامیہ اور فنون عربیہ عقلیہ نقلیہ میں نیز جدید عصری علوم و معلومات میں عظیم الشان، محیر العقول دسترس اور حذاقت و مہارت کے حامل تھے اور جس طرح وہ بیک وقت مفسر و محدث، فیلسوف و متکلم، منطقی و مناظر، مبلغ و خطیب، خلاصہ یہ کہ ہر فن کے امام تھے، اسی طرح درس و بیان قلم و زبان کے بارے میں بھی آپ یکتا تھے۔

مرحوم سے میرا تعلق | آپ کی عظمتوں کو جاننے اور جانچنے کے لئے یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ

اس ناکارہ کو خدا نے ان کی صحبت و خدمت کا کافی موقع عطا فرمایا تھا۔ میری طالب علمی کے دوران دارالعلوم دیوبند میں جب وہ دورہ حدیث و تفسیر اور درجہ تکمیل کے اونچے اساتذہ میں سے تھے، اور حمداللہ، قاضی، صدرا، بیضاوی وغیرہ اس درجہ کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ اور میں بھی ان دروس کے شرکاء میں سے ایک تھا۔ تو اس وقت بھی ان کی خصوصی شفقت و عنایت شامل حال رہی۔ پھر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بھی کم و بیش دس سال تک تو وہ رفاقت و شراکت رہی کہ اگر سعادت و فرصت کے وہ لمحات مرحوم کے کسی دوسرے شاگرد رشید کو حاصل ہوتے تو وہ بہت کچھ فیوض و برکات، علوم و معلومات اور اس رہبر کامل کی خصوصیات و مزایا سے حظ وافر حاصل کر لیتا مگر میں تو اس شعر کا مصداق ہی رہا کہ ؎

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

بہرحال میں اپنی دانست کی حد تک وثوق سے کہتا ہوں کہ ایسی جامع العلوم والکمالات شخصیت کا پایا جانا مشکل ہے جن کے علمی کتابی دروس و خطبات، تقاریر و بیانات کے علاوہ عوامی محافل و مجالس، تقاریب و مجامع کا بھی ایک ایک لمحہ پُر لطف دیدہ رونق ہو اور ہر طرح کی علمی معلوماتی تاریخی سیاسی جواہر پاروں سے لب ریز رہا ہو۔

بہاولپور میں درس قرآن قیام بہاولپور کے دوران، مرحوم مدرسہ فاروقیہ میں درس قرآن دیتے رہے جس میں بیشمار خواص و عوام علماء و حکام، دانشور و مفکر مقامی غیر مقامی ہر طرح کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور سامعین کو تعجب ہوتا تھا کہ یا اللہ علوم قرآنیہ اور معارف اسلامیہ کا کس قدر بحر ناپیدا کنار ہے جو علامہ شمس الحق افغانیؒ کے سینہ میں موجزن ہے۔ اس درس میں بارہا سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی مرحوم بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔ اور کسی سے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تو جدید و قدیم علوم کا ایک سمندر ہے۔ اور قرآن کریم کا ایک مجسمہ اعجاز ہے۔ جو شمس الحق افغانی کی صورت میں موجود ہے۔

بہاول پور میں درس قرآن کریم کا صرف ڈیڑھ پارہ بمشکل زیر درس آیا ہے جس سے عوامی سطح پر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس مرد کامل کو قرآن کریم اور علوم قرآن سے کس قدر شغف تھا اور اس سلسلہ میں وہ کس قدر وسیع علوم و معلومات اور معارف و نکات جانتے تھے۔

اس درس کے بارہ میں ایک بار یہ اتفاق بھی ہوا کہ حضرۃ المرحوم ایک جمعرات کے روز خان پور جا رہے تھے جبکہ جمعہ کے روز وہ درس ہونا تھا تو اس بات کا اعلان بھی کر دیا اور مجھ سے بھی فرمایا کہ تم کو صبح میری جگہ درس دینا ہے، میں نے عرض کیا کہ یہ تو ایک بہت بڑے سپہ سالار کی جگہ میدان جنگ میں ایک کمزور

سپاہی کو کھڑا کرنا ہے، تاہم تعمیلِ ارشاد ہوگئی اور واپسی پر تحسین فرماتے رہے کہ لوگ آپ کے درس سے بھی بہت خوش ہوگئے ہیں۔

شانِ تدریس | حضرت الشیخ کی کتابِ زندگی میں آپ کی تدریس کا باب نہایت سنہری اور زریں باب ہے۔ اور عام طور پر درسِ قرآن کے علاوہ مرحوم جو علمی دروس و تقاریر اور عام مجالس میں ہر طرح کے نکات و تشریحات کے دریا بہاتے تھے ان تمام کی یاد تو کسی علم دوست مسلمان کے ذہن و دماغ سے تادمِ زیست جانیوالی نہیں ہے۔ مگر مرحوم کی علمی اور کتابی تدریس کا تو حال ہی کچھ اور تھا، آپ کی تدریس کے مراکز سرگودہا، لاہور، سجاول، دیوبند اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ڈابھیل اور کوئٹہ تمام رہے ہیں میں ذیل میں صرف دارالعلوم دیوبند اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مرحوم کے حالات اور خیالات و فرمودات پر اس سبب سے اظہارِ خیال کر رہا ہوں کہ ان دونوں جگہوں میں مجھے خدمت و ہمراہی کا شرف حاصل رہا ہے اور اس دوران سے متعلق میری تحریر میں ہر لائی ہوئی بات میرے مشاہدات، محفوظات یا مخطوطات میں سے ہے۔

دارالعلوم دیوبند | یہاں آپ سجاول سندھ سے تشریف لائے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے خاص طور پر آپ کو بلانے کی فرمائش کی تھی۔ یہاں آکر آپ نے درس شروع کیا تو دارالعلوم دیوبند کے طلبہ پر جیسے جادو ہوگیا ہو، آپ کے درس میں دور دراز کے حوالوں سے تحقیق و تجسس کا وہ مبسوط اور مفصل بیان ہوتا تھا کہ حیرت ہو جاتی تھی، آپ کا ہر درس گویا علوم و تحقیقات کا ایک سمندر ہوتا تھا۔ جو سامنے آنیوالے خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی درس گاہیں یوں تو ظاہر ہے کہ بہت وسیع ہیں طلبہ کی عظیم تعداد ہر ایک درسگاہ میں سما سکتی ہے مگر جب آپ کو شرح عقاید نسفی کی دوسری جماعت بنا کر حوالہ کی گئی تو شرکاء و سامعین کے لئے متعلقہ درس گاہ کو تو تنگ ہونا ہی تھا لیکن ساتھ ہی طویل برآمدہ اور ملحقہ میدانوں نے بھی اس عظیم جماعت کے سمونے سے انکار کر دیا۔

انہی ایّام میں آپ کے درس کی بے پناہ مقبولیّت کے تحت طلبہ نے خلاصۃ الحساب کے سلئے درخواست دی جس پر حضرت مدنیؒ نے بحیثیت ناظم تعلیمات حضرت افغانیؒ سے فرمایا کہ یہ کتاب یا تو آپ ہی پڑھا سکتے ہیں یا میں جبکہ میری مصروفیت اور معذوری آپ کے سامنے ہے۔ اور طلبہ آپ کو ہی چاہتے ہیں لہٰذا آپ ہی اس کتاب کو پڑھائیں گے۔

مولاناؒ کی ایک تقریر | اس ابتدائی دور دیوبند کے موقع پر ایک اجلاس میں آپ دارالحدیث کے عظیم ہال میں تقریر فرما رہے تھے۔ سامعین میں اساتذہ طلباء کی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ اختتامِ اجلاس کے بعد میں نے خود بعض چیدہ اور سنجیدہ حضرات سے سنا کہ "یہ شمس الحق تو بلا ہے۔" بولنے کا انداز کتنا دلکش ہے۔ اور

بیان میں مواد کی کتنی بہتات ہے، مجھے یاد ہے کہ مرحوم نے اس اجلاس میں یہ شعر بھی پڑھا تھا ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جس پر سامعین حضرت افغانیؒ کو دادِ تحسین دیتے رہے۔ اس وقت یہ شعر شاید اس قدر مبتذل نہیں ہوا تھا۔ اس سبب سے لوگوں نے اس کا اثر لیا تھا۔

تدریس کے بادشاہ ایک روز سجاول میں مولوی عبداللہ صاحب سجاول والے کے ساتھ کھانے کے دسترخوان پر مذاق ہو رہا تھا وہ حضرت افغانیؒ کے سجاول کے وقت کے شاگرد تھے۔ جو حضرت کے اوائل تدریس کا دور تھا۔ دسترخوان پر مذاق کے دوران مولوی صاحب موصوف نے کہا کہ دوستو! مجھے ہر چیز کھانے دو میں دسترخوان کا اس طرح کا بادشاہ ہوں جس طرح کہ علامہ شمس الحق افغانیؒ درس کے بادشاہ ہیں۔

اُسی سجاول مدرسہ ہاشمیہ میں جب آپ مدرس تھے اور ایک دوسرے مدرس صاحب حضرت کے کچھ حریف بننے کی لاحاصل کوشش میں بہت زور سے چلا چلا کر تقریر کرتے تھے۔ تو اس صورت حال پر حضرۃ مرحوم نے فرمایا تھا کہ ؎

ولو کان رفع الصوت علماً لامرئٍ
لکان جدیراً بالعلوم حمار

درجہ تکمیل کا درس دارالعلوم دیوبند میں جب بیضاوی شریف سے درجہ تکمیل کا حصہ آپ پڑھاتے تھے اور درس میں قرآن و قرآنیات، قرآن کی بلاغت و فصاحت، اعجاز قرآن کے معارف و نکات بیان فرماتے تھے تو ہم شرکاء درس محو حیرت ہوتے تھے کہ یہ علامہ روزگار جہاں حمداللہ کے وجود رابطی پر ہفتہ عشرہ تک درس دیکر خبایا فی زوایا الکلام کا کھوج لگا کر منطق و فلسفہ کے میدان میں یکتا ہیں اور ابوداؤد کی حدیث القلتین پر دو ہفتہ تک درس دیتے ہیں۔ وہاں وہ قرآن کے بحر ناپیدا کنار سے بھی انمول موتی نکال لاتے ہیں۔

امام غزالیؒ اور احیاء العلوم ایک بار دوران درس امام غزالیؒ کی احیاء العلوم کا یہ قصہ بھی سنایا کہ جب انہوں نے یہ کتاب مکمل کر لی اور کتابت و اشاعت کی اجازت کیلئے اسکو قاضی شہر کو پیش کیا اور اس نے اس بنا پر اسکی اشاعت سے انکار کیا کہ یہ تو بہت سخت کتاب ہے۔ علماء ظاہر پر اس میں بہت سخت نکیر کی گئی ہے۔ اور جب قاضی صاحب کے انکار پر امام صاحب مایوس ہو کر گھر گئے تو رات کو خواب میں دیکھا کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑے ہیں قاضی صاحب بھی موجود ہیں۔ حضورؐ نے امام صاحب سے فرمایا کہ تم نے جو کتاب لکھی ہے اس میں سے کچھ سناؤ۔ امام صاحب نے تعمیل ارشاد کی حضورؐ نے خوش ہو کر کتاب کی تحسین فرمائی جس پر امام

صاحب نے عرض کیا کہ حضور! آپ نے تو کتاب کو پسند فرمایا لیکن قاضی صاحب اسکی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ لکڑی لے لو اور قاضی صاحب کی پیٹھ پر مارو۔ جب امام صاحب نے تین بار قاضی صاحب کی پیٹھ پر مارا تو حضور علیہ السلام نے خود ہی سفارش فرمادی کہ اب بس کردو یہ زجر کافی ہے۔ اب قاضی صاحب تمہاری کتاب کی اشاعت کو نہیں روکیں گے۔

لطافت وظرافت | مرحوم کے درس میں تحریر وتقریر اور خطاب وبیان، معلومات عبر وبصائر کی بہتات کے علاوہ لطافت وظرافت بھی ہوتی تھی، ایک بار فرمایا کہ کسی مولوی صاحب نے اخبار کے صفحے پر موٹے حروف دیکھ کر پوچھا کہ علماء کا یہ نفرنس کیا ہے۔ جبکہ وہ عبارت "علماء کانفرنس" تھی۔ فرمایا کہ پٹھانوں کی اردو یہی ہے۔ کہ میں نے رکعت نیچے کرلی اور آنکھیں کالی کیں۔ اور جلاب کھالیا وغیرہ وغیرہ۔

فرمایا کہ قلات میں ایک مولوی صاحب تھے، پتلون سے بہت چڑتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ بازار سے پتلون کرایہ پر لے کر دفاتر میں انٹرویو دیتے ہیں۔ حالانکہ لعنت کی اس چیز کو تو دور پھینکنا ہی مسلمان کا کام ہے۔ اقول ولنعم ما قالہ اکبر الہ آبادی ؎

واسطہ کم ہوگیا اسلام کے آئین سے
دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

ایک بار ایک طالب علم نے دوران درس سوال کیا اور اپنے استدلال کیلئے کسی آیت حدیث یا عربی شعر کا حوالہ دینا چاہا مگر بھول گیا اور حضرت سے عرض کیا کہ میں اپنا مستدل بھول گیا ہوں اس پر حضرت الرحوم نے فرمایا کہ : "میاں نفسیات پر استدلال نہیں ہوتا ہے۔"

انداز تحریر | مرحوم اگرچہ کثیر التصنیف علماء میں سے نہ تھے۔ تاہم آپ کے جو مقالات ومضامین اور تقاریر وخطبات شائع ہورہے ہیں یا چند تصانیف آپ نے تحریر فرمائی ہیں یا ترمذی کی غیر مطبوعہ شرح جو دلانا خان محمد صاحب کندیاں کو بغرض طباعت دے دی گئی ہے، ان تمام کا طرز تحریر نہایت جچا تلا، تطویل وحشو سے پاک اور افادیت ومعنویت کا ایک شاہکار ہے۔ دراصل حضرۃ المرحوم کا انداز تحریر وتقریر اسطرح تھا کہ س میں نہ تو ایضاح الواضحات ہوتا تھا اور جس طرح بعض دوسرے علماء واضح اور مشہور امور کو خواہ مخواہ طویل بناکر ان میں دنیا بھر کی باتیں اور کہانیاں بھر دیتے ہیں۔ آپ کو اس طرح کرنا گوارا نہ تھا بلکہ ہر بحث وتحقیق کو ضروری پر مشتمل اور دور دراز کے مواد اور حوالوں کی روشنی میں بیان فرماتے تھے۔

علوم القرآن | اس موضوع پر آپ کی کتاب "علوم القرآن" ہمارے سامنے ہے۔ جس کی لکھائی چھپائی بالکل دور از کار ہے، مگر معنویت اور موضوع بحث، پختہ بیانی اور وسیع اور ٹھوس معلومات کے لحاظ سے بےنظیر

ہے۔ کتاب کا تھوڑا سا نمونۂ کلام پیش خدمت ہے جو مستشرقین کے بارہ میں صفحہ ۱۲۰ پر درج ہے۔

" اب انہوں (مستشرقین) نے اسی نصب العین کی تکمیل کیلئے حربی اور سیاسی میدانوں کو ناکافی سمجھ کر عملی میدان میں قدم رکھا اور استشراق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر مسلمانوں کے یقین کو کمزور کرنے اور تشکیک کا زہر پھیلانے کیلئے اسلامی تحقیق کے نام سے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے تصانیف لکھنی شروع کیں تاکہ وہ اپنے مقصد میں اس راہ سے کامیاب ہو سکیں جن امور کی وجہ سے انہوں نے اپنی کامیابی کی امید رکھی وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ مغربی قوتوں کا سیاسی عروج اور مسلمانوں کا سیاسی زوال جس سے وہ نفسیاتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مغلوب قومیں غالب قوموں کی ہر بات چاہے وہ سو فیصد غلط ہو، کمزوری کی وجہ سے یقین کرتے ہیں۔

۲۔ انگریزی دان طبقہ خاصکر مغرب زدہ طبقہ جو احساس کمتری کا شکار ہے یورپ کے مصنف کو محقق سمجھتا ہے اور اپنے دین کے ہر عالم سے متنفر رہتا ہے۔ اور یورپی مصنفین کی ہر بات کا مان لینے کا جذبہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں موجود ہے۔ اور وہ خود علم دین سے بے بہرہ اور علماء دین کیطرف نفرت کی وجہ سے رجوع نہیں کرتا ہے۔ ان کمزوریوں نے مستشرقین کی کامیابی کی راہ کھولی اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔"

ظاہر ہے کہ علوم القرآن کے موضوع پر دوسری کتابیں بھی موجود ہیں مگر ان میں وہ جوہر کہاں پایا جاتا ہے جو حضرت افغانیؒ کی خصوصیت اور امتیازیت ہے۔

عالمانہ ظرافت | دارالعلوم دیوبند میں آنے پر علامہ ابراہیم بلیاویؒ نے مرحوم کی دعوت کی تھی جس میں اشیاء خورد و نوش کا عمدہ اہتمام کیا گیا تھا۔ حضرت المرحوم نے اپنے میزبان سے کہا کہ یہ بات تو خیر مشہور بھی ہے۔ اور درست بھی کہ آپ شیخ المعقولات ہیں لیکن آج یہ معلوم ہوا کہ آپ شیخ الماکولات بھی ہیں۔

چند فرمودات | فرمایا کہ :- الفاعل الواحد یختلف فعله باختلاف القابل وقال قال الشیخ فی الشفاء . ضوء الشمس یسود بدن القصار ویبیض ثوبه والنشد ماقاله السعدی الشیرازی ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم و خس

ایک بار انوری کا یہ شعر بھی سنایا کہ ؎

عیش اندر جہاں خراں کردند
کاش کہ انوری خرے بودے

میں نے حضرت کی طالب علمی کی ایک کاپی سے یہ شعر بھی نوٹ کیا ہے کہ ؎

علاج نفس ظالم زود ہنگام جوانی کن
کہ ایں بار سیہ چوں پیر گردد اژدہا باشد

فرمایا کہ قلات میں ایک شاہراہ پہ توت کا ایک بڑا قدیم درخت ہے جس کے سایہ میں احمد شاہ ابدالی نے سفر ہندوستان کے دوران آرام کیا ہے اور اس موقع پر اپنے درباری شاعر سے کہا ہے کہ اس توت کے بارے میں کچھ کہو تو شاعر نے برجستہ کہا تھا کہ ؎

آں قادرے کہ قدرت خود را ثبوت کرد
از چوب خشک میوہ برآورد و توت کرد

فرمایا کہ دہلی کے ایک مسخرے نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری سیاہ ڈاڑھی کو چونا لگا کر سفید کر دیا جائے لوگوں نے ملامت کیا تو اس نے کہا کہ یحییٰ بن اکثم نے اسی طرح کروا کر اس حدیث کا حوالہ دیا تھا جس میں ہے سفید داڑھی والے کو خدا مایوس نہیں کرتا ہے۔

ایک بار خوش آوازی اور خوش الحانی کی بات ہو رہی تھی تو فرمایا کہ مولانا عین القضاۃ محشی میبذی جو مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے اتالیق اور ان کے والد مولانا عبدالحلیم کے شاگرد تھے۔ وہ جہاں بہت بڑے مالدار، عالم اور بلند آدمی تھے وہاں ان کی طبیعت میں حد درجہ مجذوبیت تھی۔ خوش آوازی سے مدہوش ہو جاتے تھے چنانچہ ایک محفل میں آپ کی موت ہی یوں واقع ہوئی کہ کسی خوش آواز نے نہایت جذب و استغراق سے ایک مؤثر نعت یا نظم سنائی، مولانا عین القضاۃ سن رہے تھے دوسرے سننے والے بھی جھوم رہے تھے نظم کے اختتام پر پتہ چلا کہ مولانا عین القضاۃ کی جان پرواز کر گئی ہے۔

ایک بار ہم مولانا نیاز محمد ختنی کے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں بہادلنگہ جا رہے تھے، چشتیاں کے قریب موٹر میں اساتذہ کے ادب و احترام اور کفش برداری کا ذکر ہو رہا تھا جس کے دوران میں نے تھوڑا سا تبسم کیا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ کیا بات ہے میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ پہننے کیلئے مجھے میرا جوتا رکھ رہے ہیں۔ اس پہ برجستہ فرمایا کہ بہت اچھا خواب ہے آپ مخدوم الکل بنیں گے۔ اس جلسہ کے ختم بخاری کے موقع پر یہ فارسی شعر بھی پڑھا تھا ؎

بہر تاریخ بخاری ضبط کردم در ثقات صدق ۲۹۴ تاریخ تو لا نور ۲۵۶ تاریخ وفات

فرمایا کہ امام شافعیؒ نائی کی دوکان پر حجامت بنوانے گئے ، لباس بوسیدہ تھا ، نائی نے امام کو مؤخر بھی کیا اور کام بھی بے توجہی سے کیا۔ تاہم فراغت کے بعد امام نے نائی کو بہت سے پیسے دیئے اور فرمایا کہ ۔

علیّ ثیابٌ لو یباع جمیعہا بفلس لکان الفلس منہن اکثرا

وفیہن نفس لو تباع بمثلہا نفوس الوریٰ کانت اجل واخیرا

معلومات جدیدہ | حضرۃ المرحوم کا وسعتِ مطالعہ ، قوتِ استحضار اور عام طور سے علوم اسلامیہ اور فنونِ عقلیہ عربیہ پر حاوی ہونا تو اظہر من الشمس ہے مگر جدید علوم و معلومات سے آپ کا اندازہ کیا تھا ؟ اس بارہ میں اگرچہ ماہنامہ الحق کے صفحات پر کافی ذخیرہ بالخصوص الحق کے ابتدائی رسالوں میں بکھرا ہوا ہے تاہم میں اپنے قلم سے نوٹ کیا ہوا ایک مختصر ارشاد نقل کرتا ہوں جس سے تمام صورت حال کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے ۔ ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

فرمایا کہ تمام روئے عالم کی بجلی کا وزن روشنی کے پیمانہ سے ایک بٹہ چار چھٹانک ہے ۔ یعنی سوا تولہ اور سورج کی صرف وہ روشنی جو زمین تک پہنچتی ہے اور اس سے روشنی کے علاوہ نظام کائنات کے بیشمار کام سرانجام ہوتے ہیں وہ ایک بٹہ دو ارب ہے ۔ یعنی اگر اس کے دو ارب حصے کر دیئے جائیں تو صرف ایک حصہ زمین پر واقع ہوتا ہے ۔ چنانچہ اس روشنی کا وزن چار ہزار چار سو اسی ۴۴۸۰ من ہے ۔ اور اگر اسکی قیمت لگائی جائے تو کرہ ارض کے دس ہزار سال کی کل آمدنی سورج کے ایک بٹہ دو ارب کی قیمت پوری نہیں کر سکتی ہے ۔

پھر قدرت کی اس مادی کائناتی عظمت کے بالمقابل روحانی لذت و نعمت کے بارہ میں ایک بار فرمایا کہ اگر دنیا کی تمام متعلقہ لذتوں سے بھرپور ایک گلاس شربت تیار ہو ۔ اور جنت کے ایک گھونٹ سادہ پانی کے اوپر کسی جنت والے کو پلایا جائے تو وہ اس تمام مواد کو قے کر یگا ۔

ایمان کی سادہ تعریف | فرمایا کہ مقدمہ بہاولپور میں انگریز جج نے حضرت شاہ انور شاہ صاحبؒ سے ایمان کی تعریف پوچھی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ اردو محاورہ کے لحاظ سے ایمان کی سادہ تعریف ۔ " اللہ اور رسول کے باور پر بات ماننا " ہے ۔ انگریز جج نے اس سادہ تعریف کو بہت پسند کیا اور حضرت شاہ صاحب کی عزت افزائی کی ۔

فرمایا جو جان بدن میں ڈالی گئی ہے وہ دنیا کی سڑک سے گزر کر عالم آخرت کو جاتی ہے ۔ اس وجہ سے وہ مرتی نہیں ہے ۔ فرمایا جنت میں روشنی نہیں عرش کی تجلی روشنی کا کام دیتی ہے ۔

ایک بار میرے اس سوال پر کہ صاحب منجد نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے بارہ میں کہا ہے : وکان

یقول بالتناسخ وحدۃ الوجود۔ فرمایا کہ غلط ہے۔ اور صاحب منجد کی اس غلطی کا منشاء مولانا روم کا یہ شعر ہے جو فرماتے ہیں کہ ؎

ہفت و صد ہفتاد قالب دیدہ ام   ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

ایک بار مادہ اور ایٹم پر فرمایا کہ : ؎

زندگی وہ دے جو خود زندہ نہیں
ایٹمی ذرّات پائندہ نہیں
سوشلزم کا خدا برق پارہ ہو
لوگ اس کہنے پر شرمندہ نہیں

فرمایا کہ لوگ حضرت تھانویؒ کی طرف تشدّد منسوب کرتے تھے تو حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ مجھ میں تشدّد نہیں ہے۔ تسدّد ہے۔

ایک بار بعد العصر کی ایک مجلس میں جریر و فرزدق کی باہمی مخاصمت و مہاجاۃ کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کمال الدین دمیری نے جریر کے اس شعر کو غایت درجہ ہجو قرار دیا ہے جو اس نے قوم فرزدق کے بارہ میں کہا ہے کہ ؎

قوم اذا استنبح الاضیاف کلبہم   قالوا لامہم بولی علی النار

اس پر فرمایا کہ ہاں فرزدق پر جریر کا یہ طنز بھی نہایت وزنی ہے جو کہتا ہے کہ ؎

زعم الفرزدق ان سیقتل مُعمراً   البشر بطول سلامۃ یا معمر

پھر کچھ عرصہ بعد اس شعر کو میں نے لایتۃ العجم صفدی میں خود بھی دیکھا۔

ایک بار میں نے حضرت المرحوم سے آپ کے خاندان کے کچھ علمی حریفوں کے بارہ میں پوچھا تو حضرت نے میرے سوال کے جواب میں یہ شعر پڑھ کر سنایا ؎

نزلوا بمکۃ فی قبائل ہاشم   ونزلت بالبیداء ابعد منزل

جو نہایت برموقع اور حقیقتِ حال کا عکاس ہے جس کا پس منظر بطور تمثیل عرب جاہلیت کے وسطانی دور سے جڑتا ہے۔

ایک بار امام شافعیؒ کے یہ دو شعر پڑھے ؎

اری طالب الدنیا وان طال عمرہ   ونال من الدنیا سروراً والعما
کبانٍ بنی بنیانہ فاتمہ   فلما استوی ماقد بناہ تہدما

اسی طرح امام شافعیؒ کا یہ شعر بھی سنایا ؎

اذا هبت رياح فاغتنمها

فان بكل خافقة سكوط

فرمایا کہ ایک شخص نے امام شافعیؒ کے سامنے ایک شخص کی بہت تعریف کی تو امامؒ نے فرمایا: هل عاملت معه۔ قال لا۔ ثم قال الامام هلا ساخرت معه۔ قال لا۔ قال فلاتثق۔

حاجی صاحب ترنگزائی | فرمایا کہ حاجی صاحب ترنگزائی کو کسی نے انگریزوں سے لڑنے اور جہاد کرنے پر ملامت کر کے کہا کہ آپ کو تو جنت چاہئے جو خدا کی یاد اور عبادت سے ملتی ہے۔ اور وہ آپ کا عمر بھر کا مشغلہ ہے۔ تو حاجی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میاں جنت پانے کا راستہ بیشک یہ بھی ہے جو آپ نے کہا مگر یہ لمبا راستہ ہے اور جہاد جنت میں پہنچنے کا نہایت مختصر راستہ ہے۔ گویا گولی لگی اور جنت میں جانے کا پروانہ ہاتھ میں تھمایا گیا۔

اب میں اپنے اس اعتراف کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے اس مقالے سے حضرت الاستاذ المغفور لہٗ علامہ شمس الحق افغانیؒ کے مقام عالی کا ادنیٰ سا گوشہ بھی واضح نہیں ہوا ہے۔ جبکہ میرا ذہن وقلم محدود اور مرحوم کی عظمتیں لامحدود ہیں۔ اور مقالہ اس سلام پر ختم کرتا ہوں ؎

من السلام على من لست انساه

ولا يمل لساني قط ذكراه

ان غاب عني فان القلب مسكنهٗ

ومن يكون بقلبي كيف انساه

■■

اکوڑہ خٹک میں دینی وعلمی کتب کا مرکز

اہل علم دینی حلقوں کے طلبہ علوم دینیہ کے مرکز اکوڑہ خٹک میں ایک مرکزی کتب خانہ کی ضرورت تھی۔ جو ثقین کو ہر قسم کی علمی، دینی کتابیں مناسب نرخ پر مہیا کر سکے۔ دار الکتب العلمیہ کا قیام اس مقصد کیلئے ایک اہم قدم ہے۔ مناسب رعایتی نرخوں پر ہر قسم کی درسی وغیر درسی علمی ودینی کتب مہیا کرنے والا یہ واحد ادارہ آپ کا منتظر ہے۔

دار الکتب العلمیہ ـــ نزد چونگی نمبر ۲ ـــ اکوڑہ خٹک

جناب بشیر محمود اختر صاحب

قرآن
اور
کتب سماوی کی تصدیق و ترجمانی

یہ عقیدہ ایک مسلمان کا جزو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے۔ اور ان میں سے بعض پر بذریعہ وحی کتابیں نازل فرمائیں۔ اس سلسلے کی آخری کتاب قرآن مجید ہے جو اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور ان کے کئی بیانات کی ترجمانی اور توضیح بھی۔ چونکہ سابقہ کتب اب دنیا میں اپنی اصلی اور صحیح الہامی صورت میں موجود نہیں رہیں۔ اس لئے یہ تمام و کمال وہ کتابیں نہیں ہیں جنہیں کلام الٰہی کہا جا سکے۔ البتہ کلام الٰہی کے اجزاء یا اس کی تغیر و تحریف شدہ صورت بھی کسی حد تک ان میں شامل ہو تو بعید از قیاس نہیں۔ وہ تورات، زبور اور انجیل جو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی صورت میں نازل ہوئی تھی، قرآن کے نزول کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اور قرآن میں درحقیقت وہی کتابیں مذکور ہیں اور وہ انہی کی صداقت کی گواہی دیتا ہے قرآن میں صاف صاف ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اور یہ قرآن افترا کیا ہوا نہیں ہے۔ کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے قبل نازل ہو چکی ہیں۔ اور کتاب کی تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اور اس میں کوئی بات شک و شبے کی نہیں (اور وہ) رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔" (یونس۔ ۳۷)

اس آیت کے حوالے سے ایک معروف مستشرق ڈاکٹر موریس سیل (Dr. Morris Seale) نے اپنی کتاب "قرآن اینڈ بائبل[1]" کے ایک باب میں بائبل کے ان بڑے بڑے مضامین کو زیر بحث لانے کی سعی فرمائی ہے جن میں سے بعض کے بقول اُن کے قرآن نے تشریح و توضیح کی ہے۔

ڈاکٹر سیل ایک مستشرق، پادری اور معلم ہیں جنہوں نے عربی، عبرانی، عہد نامہ قدیم کے ادب، اسلام اور تصوف کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اور چالیس سال شام اور لبنان میں گذارے ہیں۔ بعد ازاں وہ بیروت کے ایک دینیاتی سکول میں تعلیم بھی دیتے رہے۔

---

[1] "Quran and Bible": Studies in Interpretation and Dialogue, Croom Helm Ltd: London, 1978.

مندرجہ بالا آیت درج کرنے کے بعد ڈاکٹر سیل اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مشترک معتقدات کو بنیاد بنا کر مسیحیوں اور مسلمانوں میں باہم افہام وتفہیم کی فضا قائم کی جا سکتی ہے۔ ان کی رائے میں پیشتر ازیں اس مقصد کے حصول کے لیے منعقدہ کوششیں اس وجہ سے ناکام رہیں کہ ایک طرف تو مسیحی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن میں بہت سارا مواد بائبل سے مستعار لیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف مسلمان اس دعوے پر اڑے ہوئے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے الہام کے علاوہ کسی اور ماخذ سے استفادہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر سیل نے اپنے مضمون کے آغاز ہی میں دو بڑی بنیادی باتوں کو اپنی طرف سے بڑی ہوشیاری اور ہنرمندی کے ساتھ بیک جنبش قلم بنیاد کے رکھ دیا حالاں کہ ان دونوں باتوں میں موجود مغالطوں کو رفع کرنا بہت ضروری تھا۔ اس لیے پہلے ان دو نکات پر اختصار سے بات ہو جائے۔

۱۔ پہلا نکتہ یہ کہ مسیحی علماء کے دعوے کے مطابق قرآن کا بہت سارا مواد بائبل سے ماخوذ ہے۔ بائبل دراصل بہت ساری چھوٹی بڑی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں عہد نامہ قدیم کی انتالیس اور عہد نامہ جدید کی ستائیس کتابیں شامل ہیں۔ بائبل کے مندرجات کو مسیحی عموماً الہامی کلام ہی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس میں تورات، زبور اور انجیل کے الہامی پیغامات بھی کسی نہ کسی صورت میں کچھ نہ کچھ اب بھی موجود ومحفوظ ہیں۔ لیکن الفاظ وعبارات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بائبل میں انسانی کلام بھی وقتاً فوقتاً شامل ہوتا گیا ہے۔ اب تو مسیحی علماء بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ اس کے متن میں اختلافات اور تضادات موجود ہیں۔ اور اسے کلی طور پر الہامی یا خطا سے پاک نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت حال اگر پیش نظر رہے تو اصل بات سمجھنے میں بڑی سہولت رہتی ہے کہ تمام انبیائے کرام مختلف ملکوں اور زمانوں میں ایک ہی پیغام لے کر آئے تھے۔ اس ایک پیغام کا منبع ایک ہی تھا اور اس پیغام ربانی کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہی تھیں۔ البتہ مختلف ادوار میں بعض جزئیات میں معمولی اختلافات کا راہ پا جانا بعید از قیاس نہیں بلکہ بعض معاملات میں ان کا ہونا قدرتی اور ضروری امر تھا۔ پھر قدیم صحف سماوی اپنی اصل شکل وکیفیت میں محفوظ نہیں رہ سکے اور اُن کی تعلیمات کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ اسی وجہ سے وہ بنیادی پیغام ان مروجہ صحیفوں میں اپنی اصلیت کے ساتھ سامنے نہیں آ سکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تورات، زبور اور اناجیل کے مقابلے میں جب اہل کتاب قرآن کریم کی تعلیمات اور روایات کو دیکھتے ہیں۔ تو اس شبہے کا اظہار کرنے لگتے ہیں کہ ان کتابوں کی باتیں قرآن میں دہرائی گئی ہیں۔ اور وہیں سے منقول ہیں۔ اصل بات صرف اتنی ہے کہ جب انہی انبیاء و اُمم کی باتیں مذکور ہوں گی جو سابقہ کتابوں میں گذر چکیں تو تو ظاہر ہے کہ وہ واقعات وافکار قرآن میں بھی ضرور آئیں گے۔ کہ اصل مقصد اور پیغام ایک ہی تھا۔ اور اسی کی تکمیل مقصود تھی۔ یہ بحث بالکل الگ ہے۔ کہ انہی بیانات کو جو بائبل کے بعد قرآن میں بھی آئے ہیں۔ تاریخی اور سائنسی طور پر پرکھیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ بائبل کے مقابلے میں قرآنی بیانات کس قدر قطعی، منطقی اور جدید ترین انکشافات

تحقیقات پر بالکل پورے اترتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی سائنسدان اور مصنف ڈاکٹر موریس بکائے نے ایسے بیانات کا تقابلی مطالعہ کر کے بتایا ہے کہ بائبل اور قرآن میں ایک ہی مضمون کے بہت سارے بیانات کے موازنے سے ان کے بنیادی اختلافات نمایاں ہوتے ہیں۔ اول الذکر کے بیانات سائنسی لحاظ سے قابل قبول نہیں ٹھہرتے جب کہ موخر الذکر کے بیانات جدید معلومات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ مثال کے طور پر تخلیق اور طوفان نوح کے واقعات کی تفاصیل۔ بائبل کا ایک انتہائی اہم تکملہ قرآن کے متن میں خروج کی تاریخ سے متعلق ہے۔ یہاں دونوں متون اثریاتی تحقیقات کے بہت ہی مطابق تھے۔ یہ تحقیقات حضرت موسیٰؑ کے عہد کی تعیین کے بارے میں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے موضوعات پر قرآن اور بائبل میں باہم بڑے اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات ان سب دعووں کو مسترد کرنے کے لئے کافی ہیں جو محمد (مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر یہ الزام عاید کرنے کے لئے بلا کسی استشہاد کئے جاتے ہیں۔ کہ انہوں نے قرآن کے متن کی ترتیب کے لئے بائبل سے مواد اخذ کیا۔[1]

بہر حال یہ اعتراض اور دعویٰ کہ قرآن کریم کا مواد بائبل سے مستعار ہے، قطعاً قابل اعتنا نہیں ٹھہرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو پھر قرآن کی تعلیمات بھی بائبل کے مطابق ہوتیں۔ اور ان میں باہم بنیادی اختلاف و تضاد موجود نہ ہوتا۔

۲۔ ڈاکٹر سیل کا اٹھایا ہوا دوسرا نکتہ یہ کہ مسلمان اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ ان کی کتاب تمام و کمال الہامی ہے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ بائبل اور قرآن میں اولین و نمایاں ترین نقطۂ امتیاز یہی ہے کہ بائبل میں شامل کتب اپنی اصل اور الہامی صورت میں محفوظ و باقی نہیں رہیں جب کہ قرآن حکیم کا ایک ایک حرف الہامی ہے اور چودہ سو سال گذرنے پر بھی اسی صورت میں محفوظ ہے۔ نہ صرف تحریری شکل میں بلکہ حفظ کی صورت میں بھی۔

مسلمانوں کے ایمان کی یہ ایک بنیادی شرط ہے کہ وہ قرآن کے ساتھ ساتھ کتب سابقہ پر بھی ایمان لائیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کتابیں بھی انبیائے کرام پر بصورت الہام نازل ہوئی تھیں۔ لیکن دست برد زمانہ سے ان کی وہ شکل و حیثیت باقی نہیں رہ سکی۔ اور ان میں تغیر و تحریف کا عمل جاری رہا۔ ان کے مقابلے میں قرآن کریم کی حفاظت کی کئی صورتیں پیدا فرما دیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اس اعزاز و اختصاص میں دنیا کی کوئی اور کتاب قرآن کریم کے مد مقابل نہیں ٹھہر سکتی۔ اس طرح مسلمانوں کا یہ دعویٰ اور ایمان کہ قرآن کریم سراپا الہام اور اللہ کا کلام ہے، کسی طرح بھی ناقابل قبول یا متنازعہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان چودہ صدیوں میں

---

[1] The Bible, the Quran and Science: Dr, Maurice Bucaille, P. 251.

اس صداقت کی لاتعداد شہادتیں اور دلیلیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف یہ ایک واقعہ پیش خدمت ہے:۔

ڈاکٹر غرینیہ پیرس کے ایک معروف اور ہر دل عزیز ڈاکٹر اور فرانسیسی پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میری جوانی سمندری سفروں میں گذری ہے۔ مجھے سمندر کے نظاروں اور سفروں کا گہرا شوق تھا۔ اس کے علاوہ میں مطالعے کا بڑا رسیا تھا۔ چنانچہ مطالعے کا شوق مجھے قرآن کے ایک فرانسیسی ترجمے تک لے آیا۔ اس پڑھتے ہوئے میری نظریں ایک آیت پر جم کر رہ گئیں۔ جس میں ایک سمندری نظارے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اسے میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ اس میں گمراہ لوگوں کی حالت کے متعلق ایک نہایت ہی عجیب تمثیل بیان کی گئی ہے وہ آیت یہ ہے:۔

" یا وہ ایسے ہیں جیسے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے کہ اس کو بڑی لہر نے ڈھانک لیا۔ اس (لہر) کے اوپر دوسری لہر، اس کے اوپر بادل (ہے۔ غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (کوئی ایسی حالت میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور دیکھنا چاہے) تو دیکھنے کا احتمال بھی نہیں اور جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے، اس کو (کہیں سے بھی) نور (نہیں دمیسر ہوسکتا)" [۱]

میرا دل اس تمثیل کی عمدگی اور انداز بیان کی واقعیت سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے دن اور رات میری طرح سمندروں میں گذرے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر گنتی کے لفظوں میں ایسی جامعیت کے ساتھ خطرات بحر کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی ﷺ اُمّی محض تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر کا نہیں کیا۔

اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہوگیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز نہیں بلکہ اس خدا کی آواز ہے جو رات کی تاریکی میں ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے قرآن کا دوبارہ مطالعہ کیا اور خصوصاً متعلقہ آیت کا خوب غور سے تجزیہ کیا۔ اب میرے سامنے مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ شرح صدر کے ساتھ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا [۲]

بہرحال ڈاکٹر سیل کے خیال میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان افہام و تفہیم کا زیادہ مفید طریقہ یہ اختیار کیا

---

[۱] سورۃ نور - ۴۰ [۲] تفصیل کے لئے دیکھئے "ہم کیوں مسلمان ہوئے" مرتبہ عبدالغنی فاروق۔ ادارۂ معارف اسلامیہ منصورہ لاہور صہ ۱۸۶ - ۱۸۹ . لاہور

جا سکتا ہے۔ کہ بائبل کے جن مرکزی تصورات کو قرآن نے جس انداز سے واضح کیا ہے اس پر کچھ توجہ صرف کی جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے جن پانچ مضامین کا انتخاب کیا اور ان پر الگ الگ بحث کی۔ وہ بصورت ترجمہ ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ خالق کائنات | بائبل کے ابتدائی ابواب کی طرح قرآن میں بھی تخلیق کے عجائبات کا بیان ملتا ہے "مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں۔ آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالی نے آسمان سے برسایا۔ پھر اس سے زمین کو ترو تازہ کیا۔ اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے۔ اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے، دلائل (توحید کے موجود) ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو عقل سلیم رکھتے ہیں۔ (البقرہ - ۱۶۴)

اسی طرح ایک آیت کا ترجمہ یوں ہے کہ

"پھر ہم نے ہی تمہاری صورتیں بنائیں" (الاعراف -۱۱)

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں عربی لفظ صورۃ (بنانا، شکل دینا) استعمال ہوا ہے۔ جو بعینہ عبرانی لفظ یسر کا مترادف ہے۔ یہ لفظ کتاب پیدائش کی اس آیت میں استعمال کیا گیا ہے۔

"اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا" (پیدائش ۲ : ۷)

یہاں مٹی کے برتن بنانے والے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک اور لسانی نکتے سے داخلی مماثلت کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ قرآن کی یہ آیت دیکھئے:۔

"آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں۔ لوگوں کے اختیاری معاملات مثل عدت مطالبہ حقوق کے) لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (روزہ، زکوٰۃ وغیرہ)۔ کے لئے" (البقرہ: ۱۸۹)

اب بائبل کی یہ آیت ملاحظہ ہو:۔

"اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں اور زمانوں اور دنوں اور برسوں کے امتیاز کے لئے ہوں" (پیدائش ۱: ۱۴)

دونوں کا بیان ہے کہ اجرام فلکی سورج اور چاند سے سال کے مختلف حصوں کا تعین ہوتا ہے۔ اور موسموں کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے لئے عربی لفظ مواقیت (مقررہ اوقات، یا موسم) عبرانی لفظ موادیم کا مترادف ہے۔

قرآن اور بائبل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان اس دنیا میں دیدار خداوندی کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ بائبل میں ہے۔

(خداوند نے موسیٰؑ سے) یہ بھی کہا کہ تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہے گا۔ (خروج ۳۳: ۲۱)

قرآن کریم کی یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:۔

(اللہ تعالیٰ کا) ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ (الاعراف: ۱۴۳)

ابلیس کا ذکر دونوں کتابوں میں قدرے مختلف پیرائے میں ہوا ہے۔ بائبل میں اسے ایک سانپ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جس نے باغ عدن میں طوفان مچایا۔ قرآن میں وہ ایک مردود　　　شیطان کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ آیت ملاحظہ ہو۔

" پھر شیطان نے (آدمؑ اور حواؑ) دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا۔ اور جس (عیش ونشاط) میں تھے۔ اس سے اُن کو نکلوا دیا تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔" (البقرہ: ۳۶)

پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُسے طویل عرصے تک کے لئے مہلت دی گئی ہے جیسے کہ ان آیات سے واضح ہوتا ہے۔

" وہ کہنے لگا کہ مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تجھ کو مہلت دی گئی"

(الاعراف: ۱۴-۱۵)

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام | دونوں صحیفوں میں حضرت موسیٰؑ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن میں ان کا ذکر کم از کم ۱۹۶ مرتبہ آیا ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا حوالہ ۹۶ بار اور حضرت عیسیٰؑ کا صرف ۲۰ مقامات پر۔ حضرت موسیٰ کا امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے براہ راست ہم کلام ہوا۔ اسی لئے انہیں کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

" اور موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا" (النساء ۱۶۴)

اس آیت سے بائبل کے ان بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

(ا) اور جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے بات کرتا ہے۔ ویسے ہی خداوند روبرو ہو کر موسیٰ سے باتیں کرتا تھا۔

(خروج ۳۳: ۱۱)

(ب) اُس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اٹھا۔ (استثنا ۳۴: ۱۰)

قرآن اور بائبل میں حضرت موسیٰؑ کے بچپن میں بچ جانے کی کہانی قدرے مختلف انداز میں ہوئی ہے۔ یہ کہانی

بائبل کی کتاب خروج کی دوسری فصل میں مکمل طور پر ملتی ہے۔ جب کہ قرآنی بیان اس کے مقابلے میں جزوی معلوم ہوتا اس میں تفصیل نہیں ملتی۔ بلکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ یہ قرآنی آیت دیکھئے۔

" اور فرعون کی بی بی نے (فرعون) سے کہا کہ یہ (بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل مت کرو۔ عجب نہیں کہ (بڑا ہوکر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچائے۔ یا ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں۔ اور ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی۔" (القصص: ۹)

اس آیت میں بطور خاص یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ مصر کے شاہی خاندان نے اس بچے کی پرورش کی جو بڑا ہوکر اس خاندان کا جانی دشمن بننے والا تھا۔ قرآن یہ بات زور دے کر بیان کرتا ہے کہ رحمت خداوندی نے حضرت موسیٰؑ کی امداد فرمائی۔ اس طرح یہ بیان بائبل کے متن کی شرح فراہم کرتا ہے۔

ایک اور مثال جس سے دونوں کتابوں کے انداز تاکید کا فرق معلوم ہوتا ہے، وہ واقعہ ہے جس میں حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ایک مصری کے مارے جانے کا بیان ہے۔ بائبل میں یہ بات یوں درج ہے۔

" پھر اس نے ادھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اُسی مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔" (خروج ۲: ۱۲)

قرآن میں حضرت موسیٰؑ کو اپنے کئے پر نادم دکھایا گیا ہے۔

" عرض کیا کہ اے پروردگار! مجھ سے قصور ہوگیا ہے آپ معاف کر دیجئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔" (القصص: ۱۶)

بائبل صرف اتنا بتاتی ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے اس عمل کے افشا کے ڈر سے مدائن کی طرف چلے گئے۔ اس کے مقابلے میں اس واقعے کی شرح کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ عمل انہیں احساس ندامت دلاتا ہے۔ جس کے سبب وہ معافی کے خواستگار ہوئے۔

پھر حضرت موسیٰؑ کے مصری جادوگروں کے ساتھ مقابلے کے واقعے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن بائبل کی شرح بیان کر رہا ہے۔ بائبل کی یہ آیت ملاحظہ ہو۔

تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادوگروں نے بھی اپنے جادو سے ہی ایسا ہی کیا۔ (خروج ۷: ۱۱)

اب قرآن کریم کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے۔

(۱) اور ہم نے موسیٰؑ کو (وحی کے ذریعے سے) حکم دیا کہ آپ اپنا عصا ڈال دیجئے سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدہا بن کر) ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کیا۔ پس (اس وقت) حق (کا حق ہونا) ظاہر ہوگیا اور انہوں نے

جو کچھ بنایا تھا سب آتا جاتا رہا۔ (الاعراف: ۱۱۷۔ ۱۱۸)

(ب) سو موسیٰ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا۔ ہم نے کہا تم ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔ (طٰہٰ: ۶۷-۶۸)

بائبل میں بتایا گیا ہے کہ مصریوں نے زمین پر جو کچھ پھینکا تھا، وہ سانپ بن گیا، جیسا کہ حضرت موسیٰ کا عصا اژدہا بن گیا تھا: تاہم قرآن میں مصری جادوگروں کو شعبدہ باز دکھایا گیا ہے۔ ان کی رسیاں وغیرہ جاندار اور متحرک دکھائی دینے لگیں۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ خوفزدہ ہو گئے۔ لیکن یہ ان لوگوں کے ہاتھ کی صفائی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدھا بن کر سارا بنا بنایا کھیل نگل گیا۔

کوہ سینا کے دامن میں پیش آنے والے واقعات کے بیان میں بھی بعض مقامات پر بائبل اور قرآن کی باہمی مماثلت ملتی ہے مثلاً اس وقت کا بیان جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کو خداوند تعالےٰ سے ملانے کے لئے خیمہ گاہ سے باہر آئے۔ بائبل میں یوں ہے:۔

"اور موسیٰؑ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا۔ کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کر اس پر اترا۔ اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا" (خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

یہاں بتایا گیا ہے کہ خوف زدہ اسرائیلی پہاڑ کے نیچے (تحت) کھڑے تھے۔ لفظ تحت زبور میں بھی مجازاً زمین کی گہرائی اندرونی حصے یا تاریک حصے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

جب میں پوشیدگی میں بن رہا تھا اور زمین کے اسفل میں عجیب طور سے مرتب ہو رہا تھا۔ تو میرا قالب تجھ سے چھپا نہ تھا۔ (زبور ۱۳۹: ۱۵)

کوہ سینائی کے واقعے کے بیان میں اس لفظ کے استعمال سے یہی خیال گذرتا ہے کہ پہاڑ عملاً ان لوگوں کے اوپر ایک گنبد کی مانند آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کا موازنہ قرآن کی اس آیت سے کیجئے جس میں لفظ رفع (بلند کرنا) استعمال ہوا ہے:۔

اور ہم نے ان لوگوں سے قول وقرار لینے کے واسطے کوہ طور کو اٹھا کر ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم سبت کے بارے میں تجاوز مت کرنا۔ اور ہم نے قول وقرار نہایت شدید لئے (النساء ۱۵۴)

اسی طرح یہ آیت دیکھئے۔

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا تھا۔ اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرا۔ (الاعراف: ۱۷۱)

اس میں خروج کے بیان کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ لرزاں تھا اور سر پر آن معلق ہوا تھا۔

۳- دس احکام | اہل علم لوگوں نے اس حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی ہے کہ موسوی شریعت کے دس احکام کی ایک روایت قرآن میں بھی ملتی ہے ۔ اگرچہ وہ قدرے نامکمل صورت میں ہے ۔ یوم سبت کو آرام کرنے کا حکم یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ لیکن اس کا ترک کیا جانا تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ حکم صرف یہودیوں کے لئے مخصوص تھا ۔ ملاحظہ ہو سورہ بنی اسرائیل : ۲۳ - ۳۸ ۔ اس کے بالمقابل کتاب خروج کا بیسواں باب اور استثنا ۵ : ۱۴،
۱۵: ۲۲، ۲۵: ۱۵ - اور ۲۷: ۱۶ نیز گنتی ۱۵: ۳۹

۴ ۔ طلائی بچھڑا | بنی اسرائیل کے بچھڑے کی پرستش کرنے کے واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے کس طرح بائبل کے بیان کی توضیح و توجیہہ کی ہے ۔ خروج ۳۲ : ۱ میں اس بات کا بیان ملتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب کوہ سینائی سے واپسی میں تاخیر ہو گئی تو بنی اسرائیل نے بتوں سے دل لگا لیا ۔ بائبل میں اس تاخیر کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ۔ اس کے برعکس قرآن میں بصراحت بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات توقع سے دس راتیں زیادہ رہی ۔

اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس شب کا وعدہ کیا اور دس شب کو ان تیس راتوں کا تتمہ بنایا ۔ سو ان کے پروردگار کا وقت پوری چالیس شب ہو گیا (الاعراف : ۱۴۲) بائبل کی طرح قرآن میں بھی ممنوعہ بت کی تشکیل میں حضرت ہارونؑ کی حصہ داری کی تصدیق کی گئی ہے ۔ دونوں بیانات اس پر متفق ہیں ۔ کہ حضرت موسیٰ نے اس غلطی پر اپنے بھائی کو بڑی سختی سے ڈانٹا تھا ۔ لیکن قرآن میں یہ واضح تفاصیل بھی مل گئی ہیں ۔

اور جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف واپس آئے ۔ غصے اور رنج میں بھرے ہوئے (کیونکہ ان کو وحی سے یہ معلوم ہو گیا تھا) تو فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی ۔ کیا اپنے رب کے حکم (آنے) سے پہلے ہی تم نے جلد بازی کر لی ۔ اور (جلدی سے) تختیاں ایک طرف رکھیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے ۔ ہارونؑ نے کہا اے میرے ماں جائے (بھائی) ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں ۔ سو تم مجھ پر (سختی کر کے) دشمنوں کو مت ہنسواؤ اور مجھ کو ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کرو ۔ (الاعراف : ۱۵۰)

قرآن نے بائبل کے بعض عقدے بھی حل کر دیئے ہیں ۔ مثلاً یہ ایک الجھا ہوا سوال تھا کہ اونٹ کے گوشت جیسی اہم خوراک قانوناً کیوں ممنوع قرار دی گئی تھی ۔ جب کہ صحرائی زندگی میں صرف یہی گوشت میسر آنے کا امکان تھا اور اس جیسی بعض اور چیزیں ۔ جواب یہ ہے کہ یہ ممانعت انسان کی گناہ گاری اور خطا کاری کے سبب بطور سزا کی گئی تھی ۔ ملاحظہ ہو یہ آیت ۔

سو یہود کے لئے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے مانع بن جاتے تھے ۔ (النساء : ۱۶۰)

۵۔ اور آخری بات ہے قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کی حیثیت کے بارے میں۔ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر قرآن میں کم از کم ۲۰ بار آیا ہے لیکن مسیحیت اور اسلام میں بنیادی فرق یہ ہے۔ کہ یہاں انہیں الوہیت کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ تاہم وہ نہایت احترام کے لفظوں سے یاد کئے گئے ہیں۔ یہ آیت دیکھئے۔

(اس وقت کو یاد کرو) جب کہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ! بے شک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمے کی جو منجانب اللہ ہوگا۔ اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ ہوگا۔ باآبرو ہوں گے، دنیا میں اور آخرت میں اور منجملہ مقربین سے ہوں گے۔ (آل عمران: ۴۵)

قرآن میں بھی حضرت عیسیٰ کو 'کلمہ' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کا موازنہ انجیل یوحنا کی پہلی آیت سے کیا جا سکتا ہے:

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔" (یوحنا ۱:۱)

علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق دوسرے بیان یعنی سورۂ مریم: ۱۹-۲۱ میں آیت (نشانی) کہا گیا ہے۔

"فرشتے نے کہا کہ یوں ہی (اولاد) ہو جائے گی۔ تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے اور اس طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنا دیں۔ اور باعث رحمت بنادیں۔ اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔" (مریم: ۲۱)

اس صفت کے لئے لوقا کی انجیل کی اس آیت سے موازنہ کیجئے۔

یہ اسرائیل میں بہتوں کے گرنے اور اٹھنے کے لئے اور ایسا نشان ہونے کے لئے مقرر ہوا ہے جس کی مخالفت کی جائے گی۔" (لوقا ۲: ۳۴)

قرآن میں سورہ آل عمران کی آیت ۴۹ میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور یہاں پھر بائبل سے مماثلت کی ایک اور صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ عہد حاضر کے بعض مسیحی یہ کہیں کہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ ان کے نصف سے زائد معتقدات کے مطابق ہے۔

جو لوگ مسلمانوں اور مسیحیوں کے باہمی مذاکرات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ چند مثالیں مزید یہ سمجھنے کے لئے کافی ہوں گی کہ دونوں ادیان میں اشتراک کے حدود خاصے وسیع ہیں۔ انہیں قرآن کے اس دعوے کی بھی توثیق کرنی چاہئے کہ وہ سابقہ صحف سماوی کی تصدیق و توضیح کرتا ہے۔

ڈاکٹر سیل کے خیالات کے مطالعے کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علماء اور محققین بھی اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں تاکہ صحیح صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔ اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنے میں مدد مل سکے۔

پروفیسر محمد اسلم صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۲)

اولیاء کرام اور سلاطین اسلام کا مرثیہ خواں

دہلی کا تازہ سفر نامہ

اسلام کی عظمت رفتہ کے کھنڈرات

خواجہ میر دردؒ کی درگاہ سے شاہ زید ابوالحسن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے شاہ محمد آفاقؒ اور شاہ گلشن مجذوبؒ کے مزاروں کا محل وقوع دریافت کیا۔

اگلی صبح میں مہرولی روانہ ہوا۔ کہنے کو تو مہرولی دہلی ہی کا ایک حصہ ہے لیکن وہاں کی آب و ہوا شہر کی نسبت زیادہ خوشگوار ہے۔ پہلے وقتوں میں دہلی کے شرفا برسات کے موسم میں شہر چھوڑ کر مہرولی چلے جایا کرتے تھے۔ اور موسم برشگال میں وہاں بڑی رونق ہو جایا کرتی تھی۔ اب دہلی کی آبادی مہرولی سے بھی آگے نکل گئی ہے۔

مہرولی کے قریب ہی رائے پتھورا کے آباد کردہ شہر "لال کوٹ" کے کھنڈرات موجود ہیں۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ ان کی بارھویں پشت میں جد امجد ابوالحسن جندی فتح دہلی سے بہت پہلے جہاد کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے کفار سے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کی قبر دروازہ شکار کے باہر فصیل سے متصل تھی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے زمانے تک اس مزار پر شب جمعہ کو انوار نظر آیا کرتے تھے۔ اب اس مزار کا سراغ بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

میں قطب مینار کے قریب جا کر بس سے اتر گیا۔ یہاں بہت سی پرانی عمارتیں قابل دید ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی نے قطب مینار سے بھی اونچا مینار تعمیر کرنے کی ٹھانی تھی اور اس کی بنیادیں پڑ چکی تھیں۔ لیکن سلطان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اب یہ کھنڈر علائی مینار کے نام سے موسوم ہے۔

علائی مینار کے قریب ہی مسجد قوۃ الاسلام شکستہ حالت میں کھڑی ہے۔ فتح دہلی سے قبل اس نواح میں ہندوؤں اور جینیوں کے مندر تھے جو مسلمانوں کی یلغار کے وقت ویران ہو گئے۔ انہی مندروں کے ملبے سے ۱۱۹۱ء میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ اب تک مسجد کے ستونوں پر بتوں کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے صاف دکھائی دیتے ہیں اس مسجد کی بلند محرابیں قابل دید ہیں۔ قطب کی عمارتوں پر پروفیسر محمد مجیب نے ایک عالمانہ مضمون لکھا تھا جو "ندر عرشی" میں شامل ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اتنی بلند عمارتیں وہی قوم تعمیر کر سکتی ہے جس کا حوصلہ بلند ہو۔

مسجد قوۃ الاسلام کے قریب ہی قطب مینار کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی بنیاد فتح دہلی کی یادگار کے طور پر سلطان قطب الدین ایبک (م ۱۲۱۰ء) نے رکھی تھی۔ لیکن وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی راہی ملک بقا ہوا۔ اس کی تکمیل سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) نے کی۔ عہد علائی میں اس کی مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ تو سلطان علاء الدین خلجی نے اس کی مرمت کروائی اور اس کا ذکر ایک کتبے میں کر دیا۔ جو مینار پر نصب ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق (م ۱۳۸۸ء) کے عہد میں اس مینار کو آسمانی بجلی سے نقصان پہنچا تو سلطان نے ۱۳۶۸ء میں اس کی تلافی کر دی۔ پروفیسر محمد مجیب نے اس طرح کے میناروں کا سراغ ترمذ کے قریب لگایا ہے جسے انہوں نے قطب مینار کے "آباد اجداد" کا نام دیا ہے۔

قطب مینار کے قریب ہی علائی دروازہ کی شاندار عمارت کھڑی ہے۔ ماہرین فن تعمیر کا یہ خیال ہے کہ منگولوں کے حملے کے وقت وسط ایشیا سے جو مسلمان کاریگر بھاگ کر دہلی آ گئے تھے، اس کی تعمیر کا سہرا ان کے سر ہے۔ اس عمارت میں سلجوقیوں کے فن تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

علائی دروازے سے گذر کر امام ضامن کے مقبرے تک پہنچتے ہیں۔ سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں ان کا نام سید محمد علی مشہدی تحریر کیا ہے۔ اس مقبرے کی عمارت ۹۴۴ھ ۱۵۳۷ء میں تعمیر ہوئی تھی اور فنی اعتبار سے قابل تعریف ہے۔

مسجد قوۃ الاسلام کے عقب میں آمنے سامنے دو مقبرے نظر آتے ہیں۔ ان میں جو مقبرہ شمال مغربی گوشے میں ہے وہ سلطان شمس الدین التمش کا ہے۔ اس مقبرے کا گنبد مدت ہوئی گر چکا ہے۔ مقبرے کی اندرونی دیواروں پر خط کوفی میں آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اس کے بالمقابل سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) کا مقبرہ بے جواب ویران پڑا ہے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی (م ۱۳۵۶ء) کے زمانے میں نماز جمعہ کے بعد لوگ بکثرت سلطان کے مزار کی زیارت کو جاتے تھے اب وہاں الو بولتے ہیں۔

قطب صاحب کی عمارتیں دیکھ کر میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک باؤلی نظر پڑی جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ ہے۔

خواجہ صاحب کی درگاہ کے احاطے میں سیکڑوں قبریں اور کئی مسجدیں ہیں۔ آخر میں ایک مسجد آتی ہے جس کے صحن میں مغل حکمران فرخ سیر کے اہل خانہ آسودہ خاک ہیں۔ اس مسجد کے عقب میں محراب سے متصل چشتیہ نظامیہ سلسلے کے مشہور بزرگ مولانا فخر الدینؒ اور ان کے پوتے حضرت نصیر الدین عرف کالے صاحب محو ابدی ہیں آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر نے شاہ فخر الدین کی مدح میں ایک منقبت لکھی تھی جس کے دو شعر قارئین الحق کے پیش خدمت ہیں ؎

مرشدِ پاک روان فخر الدین — قبلۂ و کعبۂ جان فخر الدین
اک جہاں فخرِ جہاں کہتا ہے — پر ہے فخر دو جہاں فخر الدین

حضرت کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آلِ محمد
بگذاشت فخر الدین چوں جہاں سرائے فانی — بر آستانہ جا داد آں قطب جاودانی
سال وصال آں ماہ از غیب چوں جستم — تاریخ گفت ہاتف "خورشید دو جہانی" ۱۱۹۹ھ

ومن کلام سید الشعراء فخر الدین مقبول الٰہی ۱۲۲۲ھ

حضرت شاہ فخر الدین کے خلیفہ خواجہ نور محمد مہاروی چشتیہ نظامیہ سلسلہ پنجاب میں لائے اور ان کے خلیفہ اعظم خواجہ محمد سلیمان تونسوی نے اس سلسلے کو یہاں فروغ دیا۔ سیال شریف، گولڑہ شریف، چاچڑاں اور کوٹ مٹھن میں اسی سلسلے کی خانقاہیں ہیں۔

شاہ صاحب کے مزار کے قریب ہی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کا دروازہ ہے۔ خواجہ صاحب کے مزار پر پہلے سنگ مرمر کا سادہ سا گنبد تھا۔ اب اس پر ان کے ایک معتقد نے رنگ برنگے شیشوں کا بہت ہی نفیس کام کرا دیا ہے۔ اس مزار کو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بڑا نقصان پہنچا تھا۔ مسٹر گاندھی نے اپنے قتل سے چند دن پہلے اس نقصان کی تلافی کرائی۔ ایک کتبے پر اس کی تفصیل درج ہے۔

خواجہ صاحب کے مزار سے قریب ہی ایک بلند چبوترے پر ان کے زندگی بھر کے رفیق قاضی حمید الدین ناگوری کی قبر ہے۔ موصوف شیخ الشیوخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی صاحب عوارف المعارف کے مرید تھے۔ موصوف سماع کے بڑے دلدادہ تھے۔ انہی کی ذات سے سماع کو فروغ ہوا۔

مزار کے احاطے ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو موتی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ اس مسجد میں اب ایک مسلمان خاندان نے سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس مسجد کی جنوبی دیوار کے باہر اورنگ زیب عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول اور اکبر شاہ مدفون ہیں۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی زندگی میں اپنے لیے یہاں قبر بنوائی تھی لیکن اس کی میٹی اسے رنگون لے گئی۔ اب یہ قبر خالی پڑی ہے۔

قطب صاحب کے مزار کے قریب ہی بہادر شاہ ظفر کا محل ہے جہاں وہ برسات کا موسم گذارتا تھا۔ اس محل کے صدر دروازے کے قریب ایک چبوترے پر مولانا مفتی کفایت اللہ اور ان کے رفیق خاص مولانا احمد سعید دہلویؒ کی قبریں ہیں۔ مفتی صاحب کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے۔

۶۸۶ فقیہہ الامت مولانا کفایت اللہ ۱۳۷۲ھ

ارتحال مفتیٔ اسلام سے مضطرب دل اور مختل ہے دماغ
مطلعِ انوار تھا ان کا وجود تھے وہ محرابِ شریعت کے چراغ
ان کے اٹھ جانے سے ویراں ہوگیا ملتِ اسلام کا سرسبز باغ

سالِ رحلت ہے یہ مصرع اے خیال
ہوگیا گُل آہ دہلی کا چراغ
۱۳۷۲ھ

لوح کے دوسری جانب یہ عبارت مرقوم ہے۔

الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ

مرقد مفتیٔ اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مہتمم شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی صدر اول جمعیت علمائے ہند ــــ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء

مولانا احمد سعید دہلوی کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

۷۸۶۔ نذرِ عقیدت

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

۱۔ ہندوستان کی آزادی کا نڈر جنرل اور عظیم رہنما
۲۔ جمعیت العلمائے ہند کے روحِ رواں ۳۔ آفتابِ فصاحت و بلاغت
۴۔ شہنشاہِ خطابت ۵۔ عارفِ اسرار شریعت و طریقت
۶۔ مبلغ اسلام ۷۔ متوکل علی اللہ
۸۔ علم مجلسی میں یکتا ۹۔ سخن فہم وسخن گو

مفسر قرآن سحبان الہند حضرت علامہ حافظ الحاج مولانا احمد سعید نور اللہ مرقدہٗ
تاریخ وفات ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ۔ بعد نماز مغرب

علمائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے بعد میں مہرولی کے صدر بازار میں سے گذرتا ہوا حوضِ شمسی پہنچا ایک روایت کے مطابق سلطان شمس الدین التمش نے خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ یہاں پانی کی کمی ہے لہٰذا تم ایک حوض بنواؤ۔ حضورؐ نے خود ہی زمین پر نشان لگایا۔ سلطان نے حوض تیار کرایا۔ تو اس کے کنارے اللہ والوں نے رہائش اختیار کر لی۔

حوض کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو اولیا مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ اس مسجد میں خواجہ

معین الدین اجمیریؒ۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگوں نے نمازیں ادا کیں۔ لوگ حصول برکت کے لئے اس مسجد میں نوافل ادا کرتے ہیں۔

حوض شمسی سے ذرا آگے بڑھیں تو لودھی عہد کے مشہور بزرگ شیخ سماء الدین سہروردی کی خانقاہ راستے میں پڑتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ کے بزرگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اور سیر العارفین کے مصنف شیخ جمالی ان کے دامن ارادت سے وابستہ تھے۔ شیخ سماء الدین کی نماز جنازہ حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۹۴۵ھ) نے پڑھائی تھی۔ اس کی دلچسپ تفصیل "لطائف قدوسی" میں موجود ہے۔

شیخ سماء الدین کی خانقاہ سے قریب ہی ایک پہاڑی پر جو فردوسیہ پہاڑی کے نام سے معروف ہے حضرت نجیب الدین فردوسیؒ کا مزار ہے۔ موصوف کے خلیفہ حضرت شرف الدین احمد بن یحیٰ منیریؒ نے ان کے سلسلے کو بہار اور بنگال میں فروغ دیا۔ اس سلسلے کی خانقاہیں بہار اور بنگال کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حوض شمسی کے مغربی کنارے پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا مقبرہ ہے جو زرد رنگ کے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ مقبرے کی اندرونی دیوار پر ان کے سوانح حیات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" میں یہ کتبہ پورے کا پورا نقل کر دیا ہے۔ اس مقبرے کے ارد گرد دور دور تک ویرانی نظر آتی ہے۔ کاش دہلی کے مسلمان اپنی اس متاع گراں مایہ کی کماحقہٗ قدر کرتے۔

مغلوں کے آخری دور حکومت میں حوض شمسی کے کنارے موسم برسات کے اختتام پر "پھول والوں کی سیر" کے نام سے ایک سالانہ میلہ لگا کرتا تھا۔ برطانوی عہد میں یہ میلہ بند ہو گیا۔ مرزا غالب بڑے افسوس کے ساتھ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر تھی کئی ہنگاموں پر قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

اب چند سالوں سے یہ میلہ دوبارہ ہونے لگا ہے۔ اس میلے میں پھولوں کے پنکھوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ مسلمان میلے کے اختتام پر اپنے پنکھے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر چڑھاتے اور ہندو جوگ مایا کے مندر میں لے جا کر دیوی کے چرنوں میں ڈال دیتے ہیں۔

قطب صاحب سے جو سڑک گوڑگاؤں جاتی ہے۔ اس سڑک پر اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر سلطان غیاث الدین بلبن (م ۱۲۸۷ء) کا مقبرہ ہے۔ ان دنوں محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں اس کی مرمت ہو رہی تھی۔

اس مقبرے کے عقب میں تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر جنگل میں ایک خوبصورت اور کشادہ مسجد کھڑی ہے جو اب بے چراغ ہے۔ ماہرین فن تعمیر نے اس مسجد کو لودھی عہد کے فن تعمیر کا شاہکار تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ اس کی تعمیر ہمایوں کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس وقت مسجد کے اندر ایک ہندو نوجوان بھرپور انہماک کے ساتھ فلمی گانوں کی ریہرسل کر رہا تھا۔ اس مسجد کو یوں بے آباد دیکھ کر دکھ ہوا۔ اس مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ شیخ جمالی صاحب سیر العارفین کا مزار ہے۔ مسجد کی نسبت مزار کی حالت اچھی ہے۔ مقبرے کی اندرونی دیواروں پر ساڑھے چار صدیاں گذر جانے کے بعد بھی نقش و نگار ماند نہیں پڑے۔ موصوف حضرت سماء الدین سہروردی کے مرید اور سلطان سکندر لودھی کے استاد تھے۔

شیخ جمالی کے مزار سے میں واپس آیا اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر مہرولی روڈ پر شیخ عبدالرحمن چشتی کے مزار کے قریب اتر گیا۔ اس مزار سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر علاؤ الدین خلجی کا تعمیر کردہ حوض خاص ہے۔ حوض کے کنارے سلطان فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ ہے۔ اور اس سے ملحق ایک مدرسے کی عمارت ہے۔ جو اب ویران پڑی ہے۔ امیر تیمور نے جب دہلی پر حملہ کیا تھا تو وہ اسی حوض کے کنارے ٹھہرا تھا۔ اس نے مقبرے اور مدرسے کی عمارتوں کی بڑی تعریف کی تھی۔

سلطان فیروز شاہ کے مقبرے کے قریب اور بھی کئی گنبد اور چھتریاں موجود ہیں لیکن اب وہاں قبروں کا بالکل نشان نہیں ہے۔

حوض خاص دیکھ کر میں شہر واپس آیا اور شام کو شاہ فرید ابو الحسن کی نشاندہی پر کناٹ پلیس پہنچا۔ جن لوگوں نے یہ جگہ دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں دکانیں اور دفاتر ایک گول دائرہ کی شکل میں ہیں اور وہاں اس طرح کے تین دائرے ہیں۔ درمیانی دائرے میں جو کناٹ سرکس کے نام سے موسوم ہے۔ میں ریلوے ریزرویشن آفس کے پاس اترا اور شاہ صاحب کی ہدایت پر دائرے میں چلنا شروع کیا۔ میں تقریباً ایک فرلانگ چلا ہوں گا کہ دائیں جانب ایچ بلاک میں رگھو نندن بلڈنگ کے عقب میں ایک گول تھڑا نظر آیا۔ اس تھڑے پر اب دو تین دکانیں بن گئی ہیں اور ایک ہندو نے چھوٹا سا مکان بھی بنا لیا ہے۔ اسی تھڑے پر حضرت شاہ سعد اللہ گلشن مجددی صاحب گلشن وحدت کا مزار ہے۔ مزار کے سرہانے دیوار پر ایک کتبہ نصب ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

درگاہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن مجددیؒ۔ تاریخ وفات ۱۱۵۳ھ

جامع بود میان کمالات ظاہری و باطنی و زہد و تقویٰ و تجرید و تفرید۔ ریاضت شاقہ کشید و طعام بعد از سہ روز زیادہ از سہ لقمہ تناول نکردے و تا سی سال عمر خود در یک گلیم گذرانید۔ آخر در ۱۱۵۳ھ وفات یافت۔

ایک دن شاہ صاحب یہی گلیم اوڑھے اپنے دروازے میں کھڑے تھے انہوں نے دیکھا کہ پالکیوں کا ایک

پالکی پر انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی گلیم زمین پر دے ماری اور اپنے ساتھیوں سے فرمانے لگے کہ تیس برس سے وہ یہ گلیم اوڑھ کر تہجد کی نماز ادا کر رہے ہیں لیکن جو انوار اس پالکی پر نظر آ رہے ہیں ویسے اس گلیم میں نظر نہیں آتے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا کہ اس پالکی میں خواجہ محمد زبیر سرہندی تشریف لے جا رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا "الحمد للہ! یہ نعمت ہمارے خاندان سے باہر نہیں گئی۔ موصوف ہمارے ہی پیرزادے ہیں"

شاہ گلشن مجددیؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے حضرت عبد الاحد وحدت کے مرید تھے۔ اردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی شاہ گلشن کا شاگرد تھا۔ ولی دکنی کے شاگردوں میں سے شاہ حاتم نے بڑا نام پیدا کیا۔ محمد رفیع سوداؔ شاہ حاتم کا ہی شاگرد تھا۔ اسی طرح خواجہ میر دردؔ کے والد میر ناصر عندلیب بھی شاہ گلشن کے شاگرد اور مرید تھے خواجہ میر درد کے تلامذہ میں سے بیدارؔ۔ نثارؔ۔ میر اثرؔ۔ میر المؔ۔ ہدایتؔ۔ قائم چاندپوری اور ثناء اللہ خان فراقؔ بڑے مشہور ہوئے ہیں۔

اس استاد الاساتذہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد میں ندوۃ المصنفین لوٹ آیا۔ اگلی صبح میں شاہ زید ابوالحسن کی نشاندہی پر سبزی منڈی پہنچا۔ اور برف خانے کے چوک سے میں روشن آرا بیگم کے باغ کی طرف چل پڑا۔ اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر دائیں جانب دکانوں کی قطار میں ایک چھوٹے سے کمرے میں حضرت شاہ محمد آفاق مجددی کا مزار ہے ۱۹۴۷ء میں ایک سکھ نے ان کی قبر شہید کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں نے بڑی مشکل سے اُسے وہاں سے نکالا اور فرش کھود کر مزار کا نشان تلاش کر لیا۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے۔

مزار پُر انوار۔ عارف حق حضرت شاہ محمد آفاق مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ۶ محرم الحرام ۱۲۵۱ھ یوم چہارشنبہ ۱مئی ۱۸۳۵ء

چوں جناب شاہ آفاق از جہاں — کرد رحلت سوئے جنات نعیم
گفت سال رحلتش خیر حزیں — خلد را ماوائے او کن اے کریم ۱۲۵۱

شاہ محمد آفاق حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندی کے خلیفہ خواجہ ضیاء اللہ کے مرید تھے ان کے خلفاء میں سے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی نے برعظیم پاک و ہند کے دینی اور روحانی حلقوں میں بڑا نام پایا ہے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے "ہم نے دو دکانیں دیکھی ہیں ایک شاہ غلام علی صاحب کی اور دوسری شاہ آفاقؒ کی کہ اس دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا"

شاہ فضل رحمٰنؒ اپنے مرشد کے بارے میں فرماتے ہیں "ہمارے حضرت ۱۰ ہزار مرتبہ درود شریف اور ۲۵ ہزار بار کلمہ طیبہ پڑھتے تھے اور دس پارے قرآن مجید کے تہجد میں پڑھنے کا معمول تھا کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پارے اتنی دیر میں ہو جاتے تھے کہ انجان سمجھے ایک پارہ پڑھا ہو گا۔ اور پانچوں وقت صلوۃ التسبیح پڑھتے تھے مزاج میں نہایت تواضع اور مسکنت تھی سب باتیں سنت کے مطابق کرتے تھے لیکن کسر نفسی سے ایسا فرماتے تھے کہ ہم سے جو بات موافق سنت کے ہو جاتی ہے تو عرش سے ایسا فیض آتا ہے کہ ہم نہر بنہر ہو جاتے ہیں" (باقی)

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا

بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

مولانا مفتی محمد فرید صاحب مفتی و مدرس
دار العلوم حقانیہ

صلوٰۃ تراویح آٹھ رکعت ہیں یا بیس (۲۰)؟

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین صلاۃ تراویح کی مقدار کے متعلق کہ اس کی مقدار آٹھ رکعات ہے یا بیس رکعات۔ بعض غیر مقلدین حدیث عائشہ صدیقہؓ کے بناء پر جو کہ بخاری شریف ج ۱ ص ۱۵۴ میں مروی ہے آٹھ رکعات کو سنت قرار دیتے ہیں اور بیس رکعات پر انکار کرتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب۔

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین اما بعد پس واضح رہے کہ ماہ رمضان میں نماز تراویح پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

کما صرح بہ فی الھدایۃ وشرح التنویر ومراقی الفلاح والجوھرۃ من کتب الحنفیۃ۔ وفی الروضۃ والتوشیح من کتب الشافعیۃ۔ والشرح الکبیر من کتب المالکیۃ۔ والروض ونیل المآرب من کتب الحنابلۃ

البتہ نماز تراویح کے عدد میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اس کے اتباع۔ اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ کے نزدیک اس نماز کا عدد بیس رکعات ہے۔

کما صرح بہ فی البدائع وغیرہ من کتب الحنفیۃ۔ وفی المجموع من کتب الشافعیۃ۔ وھی روایۃ عن مالک کما فی شرح المھذب۔ واختارہ ابو عمر ابن عبد البر المالکی کما فی شرح التقریب۔ وذکرہ ابن رشد فی البدایۃ عن احمد۔ ورواہ ابن قدامۃ فی المغنی عن احمد۔

اور ابن قاسم نے مدونہ میں امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ تراویح چھتیس رکعات ہیں اور وتر تین رکعات ہیں۔ اور امام ترمذی نے امام احمد سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی خاص عدد کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں توسع ہے آٹھ رکعات۔ بیس رکعات۔ چھتیس رکعات تمام کی تمام جائز ہیں۔ اور حنفیہ کے مشائخ میں سے ابن الہمام فرماتے ہیں کہ آٹھ سنت رسول ہونے کی وجہ سے مؤکدہ ہیں۔ اور بیس رکعات سنت خلفاء راشدین ہونے کی وجہ سے سنت زائدہ ہیں۔ اور بہر حال ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین میں سے کسی نے آٹھ رکعات سے زائد (مثلاً بیس رکعات کو) بدعت یا مکروہ قرار نہیں دیا ہے

البتہ بعض غیر مقلدین نے آٹھ رکعات کو مسنون قرار دیا ہے۔ اور اس سے زائد مقدار پر انکار کیا ہے۔ اور اس مسئلہ کو طلاق ثلاثہ کو ایک طلاق قرار دینے کے مسئلہ کی طرح۔ بے علم اور کم علم لوگوں کے شکار کا دام بنا رکھا ہے۔

اعاذنا اللہ من شرور الفرق الشاذۃ المخالفۃ عن السواد الاعظم

یہ بعض غیر مقلدین حضرت عائشہ صدیقہ کے حدیث سے تمسک کرتے ہیں۔

وھو ما رواہ البخاری ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ [1]

نیز یہ لوگ حضرت جابر کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں۔

وھو ما رواہ ابن خزیمۃ وابن حبان انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام بہم فی رمضان فصلی ثمانی رکعات واوتر [2] قال النیموی مدارہ علی عیسی بن جاریۃ قال الذھبی قال ابن معین عندہ مناکیر۔ وقال النسائی منکر الحدیث وعنہ ایضا متروک وقال ابو زرعۃ لاباس بہ۔ وقال فی الخلاصۃ وثقہ ابن حبان۔ وقال ابو داؤد منکر الحدیث انتہی۔

نیز یہ لوگ سائب بن یزید کی حدیث سے تمسک کرتے ہیں

وھو ما رواہ مالک فی المؤطا۔ انہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوم للناس باحدی عشرۃ رکعۃ۔

اور جمہور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

وھو ما رواہ ابن ابی شیبۃ والطبرانی والبیہقی انہ علیہ الصلاۃ والسلام یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ سوی الوتر [3] انتہی قال الزیلعی ھو معلول بابی شیبۃ وھو متفق علی ضعفہ۔

اور اس حدیث کے معلول ہونے کے باوجود اس سے استدلال درست ہے کیونکہ اس حدیث کی امت نے تلقی کی ہے اور ابن قیم اور امام سیوطی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ جس حدیث کی امت تلقی کرے تو اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔ اگرچہ یہ حدیث سنداً غیر صحیح ہو۔ نیز اس حدیث کو خلفائے راشدین کے تعامل سے عظیم تائید اور تقویت حاصل ہوئی ہے۔

---

[1] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو رمضان المبارک میں گیارہ رکعت پر اضافہ فرماتے تھے اور نہ غیر رمضان میں۔

[2] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ) کے ساتھ قیام رمضان کیا۔ اور آٹھ رکعت نماز ادا فرمائی اور وتر بھی پڑھے۔

[3] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں سوائے وتر کے ۲۰ رکعات نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

نیز جمہور بیہقی کے سنن کبریٰ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

وهي ما رواه يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب في رمضان بعشرين ركعة وفي عهد عثمان وعلي[1]

اس حدیث سے واضح طور سے ثابت ہے کہ خلفاء ثلاثہ راشدین کے دور میں بیس رکعات پر استقرار آیا ہے اور اس پر تعامل اور توارث رہا ہے۔ اور حدیث عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين (رواه ابن ماجه وغيره) کی بناء پر جیسا کہ سنت رسول کا اتباع ضروری ہے اسی طرح سنت خلفاء راشدین کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اور اس سے اعراض یا اس پر اعتراض، حدیث رسول اور قول رسول سے اعراض اور اس پر اعتراض ہے۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

نیز یہ سنت خلفاء راشدین وہ سنت ہے جس کا ادراک عقل اور اجتہاد سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی چیز کا عدد اور مقدار، فکر اور رائے سے متعین نہیں ہو سکتا۔ تو ایسی سنت درحقیقت سنت رسول ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اہل ظاہر نے اس حدیث کو سنداً و متناً معلول قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام آجری نے امام ابو داؤد سے روایت کیا ہے کہ امام احمد نے یزید بن خصیفہ کو منکر الحدیث کہا ہے۔ نیز اہل ظاہر کہتے ہیں کہ یہ حدیث متناً مضطرب ہے۔ اس کی بعض روایات میں گیارہ رکعات پڑھنا بھی مروی ہے۔ کما رواہ مالک فی الموطا۔ نیز یہ حدیث، حدیث عائشہ صدیقہ سے معارض ہے۔ جو کہ اس حدیث سے قوی ہے۔

جمہور نے ان اعتراضات سے اہل ظاہر کو دندان شکن جوابات دیئے ہیں۔ اول یہ کہ ائمہ نے اس حدیث کی تلقی کی ہے اور اس پر اخذ کیا ہے۔ اور خطیب نے اپنی کتاب الفقیہ والمتفقہ میں۔ اور ابن قیم نے اعلام الموقعین میں۔ اور امام سیوطی نے تدریب الراوی میں۔ اور ابن عبدالبر نے استذکار میں اور دیگر اہل فن نے اپنی تالیفات میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس حدیث کا اہل علم تلقی کریں تو یہ تلقی اس حدیث کی صحت کی شہادت عادلہ ہے۔

دوم یہ کہ یزید بن خصیفہ مشہور تابعی ہے۔ اس سے امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ یحییٰ بن معین اور ابو حاتم اور نسائی اور ابن سعد اور امام احمد بن حنبل نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ کما فی تہذیب التہذیب و تہذیب الکمال للمزی۔ وہدی الساری۔ اور حافظ ابن حجر نے الہدی الساری میں آجری کی روایت کا یہ جواب دیا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اثرم کی روایت میں اس کو ثقہ

---

[1] حضرت عمر فاروق رض کے عہد میں اولاً گیارہ رکعات نماز پڑھی جاتی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ نے ۲۳ رکعات پڑھنے کا حکم دیا۔ ۲۰ تراویح اور تین وتر۔ بعد میں اسی پر استقرار ہوا۔

کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ امام احمد منکر الحدیث اس راوی کو کہتے ہیں کہ وہ اپنے اقران میں کسی حدیث کی روایت کرنے میں متفرد ہو۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ ثقہ راوی کا تفرد مقبول ہوتا ہے۔ جب تک دلیل سے اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو پس اسی بنا پر یزید بن خصیفہ کا حدیث مقبول ہوگا۔

اور دعویٰ اضطراب کا جواب یہ ہے کہ ابن عبدالبر اور ابوبکر بن العربی نے روایۃ احدی عشر کو امام مالک کا وہم قرار دیا ہے لیکن چونکہ عبدالعزیز بن محمد اور یحییٰ بن سعید القطان امام مالک کے متابع ہیں۔ کما لا یخفی علی من راجع الی سنن سعید بن منصور و مصنف ابن ابی شیبہ لہذا امام مالک کا وہم میں پڑنا ناقابل تسلیم ہے

اور حافظ ابن حجر نے اس اختلاف کو اختلاف اوقات پر محمول کیا ہے۔ یعنی جب طویل قرأت کرتے تو آٹھ یا بارہ رکعات پڑھتے اور جب مختصر قرأت کرتے تو بیس رکعات پڑھتے۔ کما فی فتح الباری۔ اور بعض ائمہ نے اس اختلاف کو تدریج پر محمول کیا ہے۔ یعنی اولاً آٹھ یا بارہ رکعات پڑھتے جاتے تھے اور بالعاقبت بیس رکعات پر استقرار ہوا۔

کما قال الشعرانی فی کشف الغمۃ کانوا یصلونہا فی اول زمان عمر بثلث عشر رکعۃ ثم عمر امر بفعلھا ثلاثا وعشرین رکعۃ۔ ثلاث لھا وتر۔ و استقر الامر علی ذلک قالہ النیموی۔ کما استقر الامر فی خلافتہ علی ضرب الثمانین فی الخمر و کما استقر الامر علی النہی عن بیع امہات الاولاد و کما استقر الامر علی اربع تکبیرات الجنائز۔ و کما استقر الامر علی القرأۃ فی خلافۃ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کما فی الاوجز۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ ترجیح اور تطبیق سے اضطراب ساقط ہو جاتا ہے۔

اور اہل ظاہر کے اس اعتراض کا۔ کہ یزید کی حدیث، حدیث عائشہ سے معارض ہے جو کہ اقوی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حدیث یزید اور حدیث عائشہ صدیقہ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث عائشہ صدیقہ میں ان رکعات سے نماز تہجد مراد ہے نہ کہ قیام تراویح اور قیام رمضان۔ کیونکہ غیر رمضان میں تراویح نہیں پڑھے جاتے ہیں اور عند التحقیق تراویح اور تہجد الگ الگ حقائق ہیں اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ تراویح اور تہجد الگ الگ نمازیں نہیں ہیں تو اہل ظاہر کو کہا جاتا ہے کہ عائشہ کی حدیث میں بھی اختلاف ہے کیونکہ امام بخاری نے باب ما یقرء فی رکعتی الفجر میں عائشہ صدیقہ سے تیرہ رکعات کی حدیث روایت ہے۔

و لفظہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی باللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ ثم یصلی اذا سمع النداء بالصبح رکعتین

تو اہل ظاہر اس اختلاف اور تعارض کا کیا جواب دیتے ہیں؟

اگر اہل ظاہر یہ جواب دیویں کہ احدی عشرہ والی حدیث غالب پر محمول ہے اور زیادت بعض اوقات پر محمول ہے تو ان اہل ظاہر کا آٹھ رکعات پر جمود باطل ہوا۔ اور اپنی تلوار سے خود قتل ہوئے۔ اور اگر اہل ظاہر اس تطبیق سے اعراض کریں تو اختلافات کی وجہ سے عائشہ صدیقہ کی دونوں روایات ساقط ہوئیں۔ اور یزید بن خصیفہ کی حدیث بلا تعارض رہ گیا اور واجب العمل ہوا۔

واضح رہے کہ جمہور کا مسلک نظر اور شواہد کی رو سے بھی قوی ہے۔ کیونکہ دن رات میں بیس رکعات فرائض اعتقادیہ اور فرائض عملیہ ہیں تو مناسب یہ ہے کہ تراویح بھی جو کہ فرائض کے مکملات ہیں بیس رکعات ہوں جیسا کہ سنن قبلیہ اور بعدیہ بھی بیس رکعات ہیں۔

اہل ظاہر کے دلائل سے جوابات یہ ہیں کہ حدیث عائشہ صدیقہ تہجد پر محمول ہے نہ کہ تراویح پر۔ نیز غالب پر محمول ہے نہ کہ دائم پر۔ ورنہ عائشہ صدیقہ کے روایات متعارض ہوں گے۔ بلکہ امام احمد نے زیادات مسند میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے باسناد حسن سے۔ روایت کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سولہ رکعات نفل نماز پڑھتے تھے۔ نیز عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ابتدار پر محمول ہے جب کہ بیس رکعات پر استقرار نہ ہوا تھا۔

اور حدیث جابر سے حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے لاکنہ فعل جزوی فی لیلۃ واحدۃ لایدل علی نفی الزیادۃ فی تلک اللیلۃ۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ابتدار الامر پر محمول ہے و قدمر سابقا جواب حدیث السائب۔

واضح رہے کہ ابن الہمام سے دیگر مشائخ نے اتفاق نہیں کیا کیونکہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں بیس رکعات پڑھنا فعل رسول سے ثابت ہے۔ نیز حدیث علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین میں لفظ علیکم سنت رسول اور سنت خلفار کو یکساں متوجہ ہے۔ تو دونوں میں فرق کرنا فہم سے بالا ہے۔ نیز یہ سنت خلفار اگرچہ ظاہراً موقوف ہے لیکن درحقیقت مرفوع ہے۔

لعدم کونہ مدرکا بالرای والقیاس وھو الموفق والہادی

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

بلند ہمّت
جوانوں کی پسند
اُجالا ڈینِم
اور
صَدف شرٹِنگ
مضبوط و دیرپا اُجالا واش اینڈ ویئر ڈینم
خوشنما رنگوں میں لیجئے
صدف شرٹنگ بہت سے نئے رنگوں میں
دستیاب ہے
زندہ دل جوانوں کا ذوقِ زیبائش
آپ کے دم سے رونق اور چہل پہل ہے
TETORON
محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
Asiatic
MFTM-5-77

اعلیٰ بناوٹ

دلکش وضع

دل فریب رنگ کا

حسین امتزاج

دنیا کے مشہور

SANFORIZED

REGISTERED TRADE MARK

سنفورائزڈ پارچہ جات

سکڑنے سے محفوظ

۲۰ ایس سے ۸۰ ایس کی سوت کی

اعلیٰ بناوٹ

گل احمد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

ستار چیمبرز

۲۹- ویسٹ وارف کراچی

ٹیلیفون

۲۳۳۹۹۳ ، ۲۳۸۶۰۵

۲۲۵۵۳۹

تار کا پتہ:- آباد ملز

PID ISLAMABAD

Sasa 83